فسانہ

شرح چندہ
سالانہ دس روپیہ
عام شمارہ ایک روپیہ
خاص شمارہ ڈیڑھ روپیہ

رہنما
بلونت سنگھ

مدیر
مسعود احمد

خطاط
سید احمد حسین

فسانہ میں شائع ہونے والے تمام ادبی یا نیم ادبی مواد میں نام، مقام، واقعات اور ادارے قطعی فرضی ہوتے ہیں اور حقیقی افراد، مقامات، واقعات، یا اداروں سے ان کی کوئی مطابقت محض اتفاقیہ ہے جس کے لئے ایڈیٹر، پبلشر یا مصنف پر کوئی ذمہ داری عاید نہیں ہوتی ——

ناظم :- عبد القدوس رومی
طابع وناشر :- مسعود احمد
مطبوعہ :- اسرار کریمی پریس، الہ آباد
ٹائیٹل :- بہار گو پریس، الہ آباد
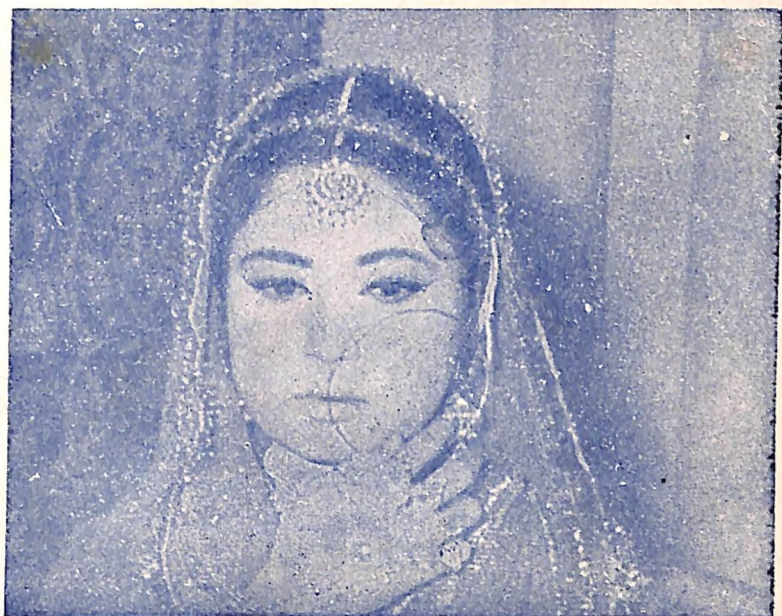
دفتر فسانہ
۲۱۶ - دائرہ شاہ اجمل - الہ آباد۳

صنم کدہ
کی
اوّلین پیشکش
بہو بیگم
ہدایت :- ایم صادق
نغمے :- ساحر
موسیقی :- روشن
کہانی :- جاں نثار اختر
عکاسی :- ثریان ایرانی
سرزمین اودھ کی حویلیوں کی
داستان جن کے دروازوں
پر کبھی ہاتھی جھومتے تھے اور
نوبت بجا کرتی تھی ـــــ لیکن
آج گردش زمانہ کے ہاتھوں
اُن کے در و دیوار مسمار ہو چکے
ہیں اور عظیم کھنڈروں سے
حسرت برس رہی ہے۔
ستارے
مینا کماری
اشوک کمار
پردیپ کمار
ایسٹ مین کلر میں

فہرست

ادارایہ

خُدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ فسانہ کا خاص نمبر آپ کی خدمت میں حاضر ہے اسے دلچسپ اور پُر لطف بنانے میں اپنی بساط کی حد تک کوئی کمی باقی نہیں رکھی ہے۔ ہم اپنی کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں اس کا فیصلہ اربابِ ذوق اور اہلِ نظر ہی فرما سکتے ہیں۔

ہم نے یہ بھی کوشش کی ہے کہ اس شمارہ میں ہندوستان کی مختلف زبانوں کی معیاری کہانیاں آپ کی خدمت میں پیش کردیں جس سے آپ حضرات اُردو کہانیوں کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں کے ادب و معیار کا بھی اندازہ فرما سکیں۔ اور آپ کو معلوم ہو جائے کہ دوسری زبانوں میں بھی کیسی خوبصورت اور صاف ستھری کہانیاں شائع ہو رہی ہیں

اس خاص نمبر میں مختلف مذاقوں کی رعایت رکھتے ہوئے تنوع کا خیال خاص طور پر رکھا گیا ہے۔ اُردو کہانیوں میں "دیوتا کا جنم" بلونت سنگھ کی بہترین کہانی ہے جس کو دیکھ کر انکی عظمت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ تامل کہانی "صلیب" نہایت ہی پاکیزہ اور اخلاقی کہانی ہے جس کی کامیابی پر اصل مصنف کے ساتھ ساتھ فاضل مترجم جناب حیات محمد بادشاہ صاحب بھی تعریف کے مستحق ہیں۔ ڈاکٹر عبدالودود صاحب ہمارے دوہرے شکریہ کے مستحق ہیں جنھوں نے ازراہ عنایت ہمیں دو کہانیوں کے ترجمے عنایت فرما دیئے۔ "پُھلوا" اور "تلاش" دونوں ہی کہانیاں ہمیں ڈاکٹر صاحب کی بدولت ملیں۔ عربی کہانی "زندگی سے فرار" بھی خاصے کی چیز ہے۔ محدود سطور میں تفصیلی تبصرہ کی گنجائش نہیں ہے ویسے ساری کہانیاں آپ کے خصوصی مطالعہ کی مستحق ہیں۔ خاص کر آخری کہانی "محبت" ایسی پاکیزہ تخلیق ہے جس کی یاد آپ کو مدتوں رہے گی۔

آخر میں ہم اپنے کرمفرما قلمی معاونین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان سے درخواست کریں گے کہ وہ ہمیں آئندہ بھی اپنی عنایات سے نوازتے رہیں۔ ———

مُدیر

ہر دس منٹ پر
فرحت اور تازگی کے لئے
چیتا فائٹ
بیڑی
پیجئے
H.L.M. BIRI WORKS
حاجی لعل محمد بیڑی ورکس، میر گنج الہ آباد
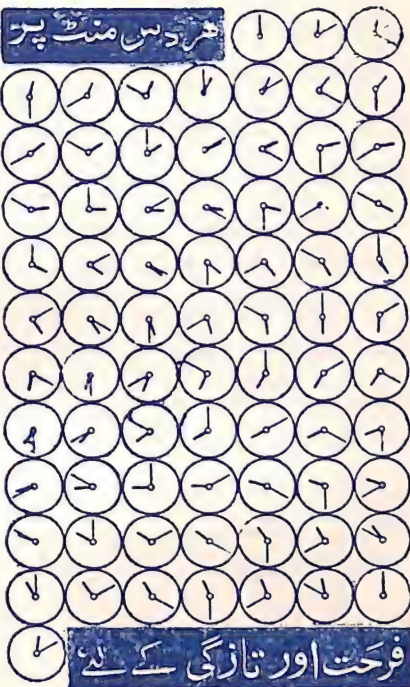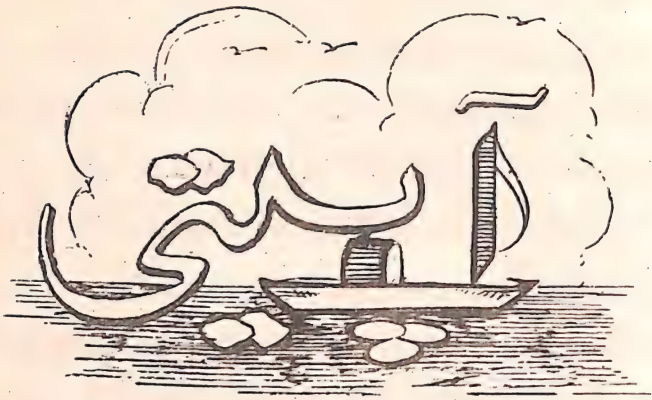
نیاز فتحپوری

میری عمر اس وقت ۸۰ سال کی ہے اور پانچ سال کی عمر سے لے کر اس وقت تک ۷۵ سال کے تمام واقعات میرے ذہن میں محفوظ ہیں، اس لیے اگر اس پون صدی کے دنوں کا شمار کیا جائے جو ۲۷۳۷۵ ہوتے ہیں اور ہر دن کے لیے اوسطاً میں صرف ایک سطر لکھنے پر قناعت کروں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ۱۵ سطر کے مسطر پر میں نے ۲۵۰۰ صفحات کی کتاب لکھ دی۔ حالانکہ میں نے اپنی زندگی کے کچھ دن ایسے بھی گزارے ہیں کہ ان کا ایک ایک لمحہ پوری "داستانِ ہوشربا" ہے اور "شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں" تو پوری "تاریخِ ظلمات" ہے۔ پھر بتائیے کہ یہ سب کچھ لکھنے کے لیے "کہاں سے جگر آئے ــــ" لیکن چونکہ طفیل* صاحب کا اصرار بھی قضائے مبرم سے کم نہیں اس لیے سرگذشت تو نہیں، اپنی سخت جانی کے چند واقعات سُنا کر اس مصیبت کو ٹالنے کی کوشش کرتا ہوں۔

دنیا میں غالباً کوئی ایسا شخص نہیں جو کسی نہ کسی حادثہ سے دوچار نہ ہوا ہو۔ حادثہ سے میری مراد اعزّہ و اقربا کی موت نہیں کیونکہ اوّل تو موت کوئی حادثہ نہیں زندگی کا انجام ہے (اور اگر ہو بھی تو باور کیجیے کہ اس وقت تک میں دو سو سے زیادہ اپنے عزیزوں اور دوستوں کو سپردِ خاک کر چکا ہوں) بلکہ حادثہ سے مراد وہ آفاتِ ارضی و سماوی ہیں جو خلافِ توقع بالکل اچانک سامنے آجاتے ہیں اور ان کا نتیجہ اکثر و بیشتر موت ہی ہوا کرتا ہے۔ پھر اگر میں یہ کہوں کہ حوادثِ اربعہ عناصر کی کوئی صورت ایسی نہیں جو مجھے پیش نہ آئی ہو، تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ مجھ سا سخت جان مجھ سا

---

* جناب محمد طفیل۔ مدیر نقوش
نقوش شخصیات نمبر سے ماخوذ

خوش نصیب انسان کوئی اور مشکل ہی سے آپ کو نظر آئے گا۔

دنیا کے وہ عناصر جن پر انسانی زندگی کا انحصار ہے، چار ہیں:۔ آبؔ، آتشؔ، خاکؔ، بادؔ اور اگر ان میں سے کوئی ایک بھی آپ کا دشمن ہو جائے تو زندہ رہنے کی کوئی صورت نہیں۔ لیکن باور کیجئے کہ میں نے ان چاروں عناصر کی شدید گرفت میں آجانے کے بعد بھی ان کا مقابلہ کیا اور کامیاب ہوا۔

(۱) طالب علمی کا زمانہ ہے اور میں اپنے وطن فتحپور میں ہوں، عمر بارہ سال کی ہے اور سنہ ۱۸۹۶ء۔ ہر جمعہ کی صبح کو چند ساتھیوں کے ساتھ آبادی سے باہر نکل کر دن بھر باغ وصحرا میں چکر لگانا، زندگی کا معمول ہے۔ ایک مرتبہ بارش کے زمانہ میں ہم سب ایک باغ میں جمع ہیں اور فکر یہ ہے کہ صرف آموں سے پیٹ بھریں۔ چونکہ یہ باغ میرا ہی تھا اس لئے سوال سرقہ کا بھی نہ تھا۔ آم کا ایک درخت وسیع پختہ کنوئیں کے کنارے واقع تھا اسی پر سب چڑھ گئے اور آم توڑنے میں مصروف ہو گئے۔ دفعتاً پورب کی طرف سے ایک سیاہ آندھی اُٹھی اور آناً فاناً اتنی تاریکی ہو گئی کہ ہاتھ کو ہاتھ سُجھائی نہ دیتا تھا۔ اسی کے ساتھ ہوا کی تیزی کا یہ عالم ہو گیا کہ درخت جس پر ہم لوگ سوار تھے پرِکاہ کی طرح ہلنے لگا اور اس کی شاخیں چرچر کرنے لگیں۔ کچھ خبر نہ تھی کہ ہم لوگ کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ ہوش وحواس، بصارت وآواز سب گم۔ چند منٹ نہ گزرے تھے کہ شاخیں ایسی چرچراہٹ کے ساتھ کہ جیسے کوئی مہیب دیو چیخ رہا ہو ایک ایک کرکے زمین پر آرہیں۔ اتفاق سے وہ شاخ جس پر میں بیٹھا ہوا تھا کنوئیں پر گری اور بجائے اس کے کہ زمین سے ٹکرا کر میرا سر پاش پاش ہو جاتا، میں کنوئیں کے خلا میں لٹک گیا۔ کنواں کافی گہرا تھا اور اگر شاخ میرے ہاتھ سے چھوٹ جاتی تو میں یقیناً ڈوب جاتا، لیکن میں نے اپنے حواس بجا رکھے (آندھی بھی اب گزر گئی تھی) اور پھر شاخ پر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ مگر پاؤں اب بھی پانی کی سطح چھو رہے تھے۔ کافی دیر کے بعد لوگ ہماری تلاش میں نکلے اور جب انھوں نے مجھے کنوئیں سے باہر نکالا تو میں نے دیکھا کہ میرے تمام ساتھی شاخوں میں اُلجھ کر ختم ہو چکے تھے۔

(۲) رام پور میں ہوں۔ میرے والد بھی پنشن لینے کے بعد وہیں وکالت کر رہے ہیں، اور میں مولانا محمد وزیر خاں سے فلسفہ والٰہیات پڑھ رہا ہوں۔ یہ بات ۱۸۹۸ء کی ہے۔ مولانا مجھ پر بڑی شفقت فرماتے تھے اور رات کو بھی میں انہی کے مکان کے بیرونی کمرہ میں سوتا تھا کیونکہ میں صبح زیادہ دیر میں اُٹھنے کا عادی تھا اور والد مرحوم بہت صبح تہجد کے وقت بیدار ہو کر سب کو جگا دیتے تھے۔

میرا معمول تھا کہ رات کو سونے سے قبل کم از کم دو گھنٹہ ضرور مطالعہ کتب میں صرف کرتا۔ جاڑوں کا زمانہ تھا کہ ایک رات میں کتاب دیکھتے دیکھتے سو گیا اور چراغ گُل نہ کر سکا (اس وقت

بجلی کیا لالٹین کا رواج بھی کم تھا) رامپور میں سردی زیادہ ہوتی ہے اس لیے دو دو رضائیاں ملا کر مجھے اوڑھنا پڑتی تھیں، انہیں میں لپٹ کر غافل سو گیا۔ کمرہ میں میرے سوا کوئی نہ تھا۔ صبح تین بجے دفعتاً میں نے محسوس کیا کہ دم گھٹ رہا ہے اور گھبرا کر آنکھ کھولی تو دیکھا کہ سارے کمرہ میں دھواں بھرا ہوا ہے۔ میرا بستر، میری رضائیاں اور تکیے نصف جل چکے ہیں۔ اور میرے جسم کے کپڑے بھی سُلگ رہے ہیں۔ معلوم نہیں کس وقت چراغ کی بتّی بستر پر آ گری اور کپڑوں نے آگ پکڑ لی۔ چونکہ کمرہ چاروں طرف سے بند تھا اور ہوا کے گزرنے کی کوئی صورت نہ تھی اس لیے آگ شعلہ نہ بن سکی اور میں بالکل محفوظ رہا۔

(۳) اب سے پورے ۶۳ سال قبل (۱۹۰۰ء) کا ذکر ہے، میں مراد آباد کے پولیس ٹریننگ اسکول میں ٹریننگ پا رہا ہوں اور معمولاً ہر تعطیل میں رامپور اپنے والد کے پاس چلا جاتا ہوں۔ زیادہ تر ریل سے اور کم تر تانگے پر۔ رامپور اور مراد آباد کا فاصلہ بہت کم ہے۔ زیادہ سے زیادہ بارہ چودہ میل اور ان دونوں شہروں کے درمیان سڑک کا راستہ بڑا آباد رہتا تھا۔ تانگے، یکّے، بیل گاڑیاں، وغیرہ سبھی چلتے تھے۔ مراد آباد دریائے رام گنگا پر واقع ہے اور رام پور دریائے کوسی پر اور یہ دونوں بارش کے زمانہ میں بہت پُرشور اور خطرناک ہو جاتے ہیں اس لیے اس زمانہ میں کشتیوں کے ذریعہ سے ان کو عبور کرنا خطرہ سے خالی نہیں ہوتا، تاہم جانے والے جاتے ہی تھے۔ علی الخصوص غلّہ وغیرہ تو عموماً کشتیوں ہی پر پار ہوتا تھا۔

جب جولائی ۱۹۰۰ء میں اسکول ایک ہفتہ کے لیے بند ہوا تو معمولاً میں نے رام پور جانے کا قصد کیا۔ میرے ساتھیوں میں چند ایسے بھی تھے جنھیں رام پور سے ۳۰ میل اور آگے بریلی جانا اور ریل پر جانا تھا۔ انھوں نے اصرار کیا کہ میں بھی ان کے ساتھ بریلی چلوں لیکن میں نے انکار کر دیا اور دفعتاً یہ خیال پیدا ہوا کہ اس مرتبہ کیوں نہ ریل کی جگہ یہ سفر تانگے پر کیا جائے۔ اس سال بارش غیر معمولی طور بہت زیادہ ہوئی تھی اور رام گنگا کی طغیانی نے کشتی کے سفر کو بہت خطرناک بنا دیا تھا۔ لوگوں نے مجھے سمجھایا بھی کہ یہ ارادہ ترک کر دوں لیکن میں نہیں مانا۔ کیونکہ میری فطرت شروع ہی سے ایسی تھی کہ جب امن و خطرہ کی دونوں راہیں میرے سامنے ہوتی تھیں تو ہمیشہ خطرہ کی راہ اختیار کرتا تھا اور آخر کار میں نے فیصلہ کر لیا کہ رام گنگا کو کشتی ہی پر عبور کروں گا۔

اس وقت رام گنگا کا یہ عالم تھا کہ حدِ نظر تک پانی ہی پانی نظر آتا تھا اور اس کی پُرشور اونچی اونچی لہریں سمندر کا منظر پیش کر رہی تھیں۔ یوں تو ساحل پر متعدّد کشتیاں رہتی تھیں لیکن

لیکن بارش کے زمانہ میں صرف بار برداری ہی کی بڑی کشتیاں کام کرتی تھیں اور دن میں صرف ایک بار آتی جاتی تھیں۔

میں صبح آٹھ بجے ساحل پر پہنچ گیا۔ ایک بڑی کشتی جو مردوں، عورتوں، بچوں، گائیوں، بھینسوں، گھوڑوں اور غلّہ کی بوریوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی، چھوٹنے والی تھی۔ میں بھی جلدی جلدی رتیلے ساحل کو عبور کرکے کشتی کے ایک کونہ میں بیٹھ گیا اور وہ چل پڑی۔ معلوم ہوا کہ کم از کم چار گھنٹے اسکے دوسرے کنارے تک پہنچنے میں لگیں گے۔ اس وقت دریا کا پاٹ ایک میل سے کم نہ تھا اور حالت یہ تھی کہ کشتی جتنی آگے بڑھتی جاتی تھی پانی کی زبردست لہریں اُٹھ اُٹھ کر اسے پیچھے ڈھکیل دیتی تھیں اور وہ کانپ کانپ کر رہ جاتی تھیں۔ خدا خدا کرکے دوپہر تک وہ وسط دریا میں پہنچی جہاں اس کے دھاروں کا پورا زور تھا لیکن شومئی قسمت کہ ٹھیک اسی وقت کشتی کی تہہ میں ایک بڑا سوراخ پیدا ہو گیا اور ایک بلند فوارہ پانی کا اُچھلنے لگا۔ ملّاحوں نے انتہائی کوشش کی کہ یہ سوراخ کسی ترکیب سے بند ہو جائے لیکن وہ کامیاب نہ ہوئے اور اب اس کے سوا کوئی دوسری صورت باقی نہ رہی کہ جو پانی کشتی میں آ رہا ہے اسے اُلیچ اُلیچ کر باہر پھینکتے رہیں۔ چونکہ خطرہ جان کا تھا اس لیے سبھی مسافر اس کام میں لگ گئے لیکن پانی اتنی تیزی سے اندر آرہا تھا کہ اس کا مقابلہ ممکن نہ تھا۔ آخر کار رفتہ رفتہ پانی اتنا بڑھا کہ غلّہ کے بورے نصف نصف ڈوب گئے، اور جو جانور کشتی میں کھڑے تھے پانی ان کے گھٹنوں تک پہنچ گیا۔ مسافروں کی پریشانی، عورتوں کی گریہ وزاری، بچوں کی چیخ وپکار نے قیامت برپا کر رکھی تھی اور میں بھی ایک کونہ میں بیٹھا ہوا اپنی حماقت پر افسوس کر رہا تھا۔

کشتی کی رفتار اب بہت سست ہو گئی تھی کیونکہ اس پر پانی کا وزن بھی بڑھتا جاتا تھا۔ اور پتواروں سے کام لینا بھی ملّاحوں کے لیے ممکن نہ تھا۔ تاہم چونکہ ہوا کا رخ موافق تھا اس لیے وہ آہستہ آہستہ آگے سرکتی جا رہی تھی۔

رام گنگا کے بعض دھارے تو بیچ میں تھے لیکن ایک سب سے زیادہ خطرناک دھارا مشرقی ساحل کے قریب تھا اور اب کشتی کا رُخ اسی طرف تھا۔ لوگوں کو بالکل یقین تھا کہ کشتی اس دھارے سے صحیح وسلامت نہ گزر سکے گی اور اس یقین کے تحت سراسیمگی کا جو عالم ہونا چاہیے وہ انتہائی نقطہ تک پہنچ گیا تھا اور چیخ پکار، ہائے وائے نے طوفان کے شور کو بھی دبا دیا تھا۔

مجھے کیا سبھی کو یقین تھا کہ بچنے کی اب کوئی صورت باقی نہیں اور فرط مایوسی سے ہر شخص نڈھال تھا۔ میں نے سوچا کہ جان تو جاتی ہی ہے کیوں نہ کوئی آخری کوشش جان بچانے

کی کی جائے۔ میں سمجھتا تھا کہ جس وقت کشتی مشرقی دھارے پر پہنچے گی تو یقیناً ڈوب جائے گی۔
اس لیے میں نے مسافروں سے کہا کہ جان بچنے کی صورت اگر کوئی ہے تو صرف یہ کہ جو لوگ پیرنا
جانتے ہیں وہ اپنے آپ کو دریا میں ڈال دیں اور ساحل تک فاصلہ (جو ۱۰۰ گز سے کم نہ تھا) پیر کر
عبور کریں۔ یہ کہہ کر میں نے پانی میں چھلانگ ماری اور میرے ساتھ دس بارہ آدمیوں نے اور بھی۔
—— میرا یہ فعل یقیناً خودکشی کے مترادف تھا لیکن اس کے سوا کوئی دوسری صورت مفر کی تھی بھی نہیں۔

جس وقت میں پانی میں کودا تو ایک لہر مجھے سیدھی تہ تک لے گئی لیکن میں چونکہ فنِ شناوری سے واقف تھا اور زمانہ بھی عنفوانِ شباب کا تھا اس لئے میں ہاتھ پاؤں چلا کر ابھرا اور موجوں سے لڑتا بھڑتا ساحل کی طرف بڑھا۔ چیخ پکار کی آواز اب بھی میرے کانوں میں آرہی تھی۔ لیکن پھر مڑ کر میں نے کشتی کو نہیں دیکھا۔ اس کے دس منٹ بعد جب میں کنارے تک پہنچ گیا اور پلٹ کر کشتی کو دیکھنا چاہا تو ایک بھنور کے سوا جو ساری کشتی کو مع اس کے مسافروں کے نگل چکا تھا اور کچھ نظر نہ آیا۔

(کھ) ۱۹۰۹ء میں میرا تعلق ریاست باؤنی کدورہ (بندھیل کھنڈ) سے ہوگیا تھا۔ نواب ریاض الحسن خاں کا عہد حکومت تھا۔ اس وقت میرے بہنوئی محمد سلیمان خاں، مودہا (ضلع ہمیر پور) کے تھانہ میں مامور تھے اور میں ہر پندرہویں دن اپنی بہن کو دیکھنے وہاں چلا جاتا تھا۔ فاصلہ صرف دس بارہ میل کا تھا جسے میں گھوڑے پر طے کرتا تھا یہ سفر میری انتہائی تفریح کا ہوتا تھا کیونکہ بالعموم میں شام کو چلتا تھا اور راستہ کے سنسان جنگلوں کو طے کرتا ہوا رات کو ۹ بجے مودہا پہنچتا تھا۔ گھوڑے کی سواری کا مجھے بڑا شوق تھا اور جب اس کا موقع نہ ہوتا تھا تو پھر میں پیدل سفر کرتا تھا۔ چنانچہ میری عمر کا وہ حصہ جو بندھیل کھنڈ میں بسر ہوا یا تو گھوڑے کی سواری کے لیے وقف تھا یا پیدل چلنے کے لیے اور اس سلسلہ میں جن جن مصائب سے دوچار ہونا پڑا وہ ایک علیحدہ مستقل داستان ہے۔ جس کے چھیڑنے کا یہ موقع نہیں۔ اس وقت تو صرف اس حادثہ کا ذکر سن لیجئے جو ایک بار کدورہ سے مودہا جاتے ہوئے پیش آیا۔

میں شام کو کدورہ سے چلا لیکن ذرا دیر سے، اس لیے جب میں جاگیر بیری کے قریب پہنچا جو کدورہ سے صرف تین میل دور تھی تو آفتاب غروب ہو چکا تھا اور رات کا دھندلکا شروع ہوگیا تھا۔ جاگیر بیری ایک اونچی پہاڑی پر دریا کے کنارے واقع ہے اور مودہا جانے کے لیے اس دریا کو عبور کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس دریا کے دونوں کناروں پر دور دور تک ریت پھیلی ہوئی ہے اور یہ

ریت کے اس حصے کو معمولاً پیدل طے کرتا تھا تاکہ گھوڑے پر زیادہ بوجھ نہ پڑے لیکن اس مرتبہ دیر ہو جانے کی وجہ سے میں گھوڑے ہی پر سوار رہا اور اس کو تیز تیز چلانے لگا۔

اس دریا کے متعلق مشہور تھا کہ اس کے کناروں پر کہیں کہیں چور بالو بھی پائی جاتی ہے۔ چور بالو سے مراد وہ رتیلا حصہ ہے جو بظاہر صاف و مسطح نظر آتا ہے لیکن پانی کی سطح سے قریب تر ہونے کی وجہ سے بڑا خطرناک ہوتا ہے اور اس پر پاؤں رکھتے ہی آدمی ہو یا جانور اندر دھنسنے لگتا ہے۔ میں نے بارہا اس دریا اور اس کے ریگستانی حصہ کو طے کیا لیکن کبھی چور بالو سے واسطہ نہیں پڑا۔ اس مرتبہ چونکہ مجھے جلدی تھی اس لیے معمولی راستہ سے ہٹ کر میں نے مختصر راستہ اختیار کرنا چاہا اور گھوڑے کو اسی طرف ڈال دیا۔ تھوڑی دور چل کر مجھے ایک رتیلی تنگنائے ملی اور میں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی تاکہ وہ اسے پھاند کر گزر جائے۔ میں تاریکی میں اس کی چوڑائی کا صحیح اندازہ نہ کر سکا تھا، زیادہ سے زیادہ میں اسے تین گز سمجھتا تھا حالانکہ وہ چھ گز سے کم نہ تھا۔ پھر میرے ایڑ لگانے پر گھوڑے نے جست تو کی لیکن وہ اس فاصلہ کو عبور نہ کر سکا اور اس کے اگلے پاؤں رتیلے حصہ کے اندر ہی رہے۔ خیر یہ تو کوئی بات ایسی نہ تھی کہ میں اس پر دھیان دھرتا لیکن جب اس کے بعد دفعتاً گھوڑا اندر دھنسنے لگا تو مجھے پتہ چلا کہ ہم چور بالو میں پھنس گیا ہوں۔ چور بالو سے جان بچانے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ اس سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں نہ مارے جائیں (کیونکہ اس طرح آدمی اور اندر دھنستا چلا جاتا ہے) بلکہ اپنے آپ کو بالو پر چت یا پٹ ڈال دیا جائے۔ اگر میں گھوڑے پر سوار نہ ہوتا تو بیشک اس ترکیب پر عمل کر سکتا تھا لیکن اب کہ گھوڑا سینہ تک دھنس چکا تھا اور میں بھی اس کے ساتھ گھٹنوں گھٹنوں بالو کے اندر غرق تھا، کیونکہ اس پر عمل کر سکتا تھا۔ غور کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ گھوڑے کو بچانا تو ممکن نہیں اس لیے اس کے ساتھ اپنی جان کیوں گنوائی جائے۔ میں نے آہستہ آہستہ اپنے دونوں پاؤں رکاب سے نکال کر اوپر نکالے اور فوراً چور بالو پر بے حس و حرکت لیٹ گیا لیکن لگام بدستور اپنے ہاتھ میں رہنے دی کہ ممکن ہے اس کے جھٹکا دینے سے گھوڑا کسی وقت اوپر آجائے۔ اتفاق کی بات کہ اسی وقت بیری کے دو راجپوت گھر لوٹتے وقت میرے پاس سے گزرے اور میں نے انھیں آواز دی۔ وہ غریب دونوں دوڑتے ہوئے آئے اور انھوں نے اپنی پگڑی کھول کر اس کا ایک سرا میری طرف پھینکا کہ اسے مضبوط پکڑ لوں اور جب میں نے اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا تو انھوں نے مجھے آہستہ آہستہ گھسیٹنا شروع کیا اور میں اس چور بالو سے نکل گیا۔ اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوا

کہ گھوڑے کو کیونکر نکالا جائے، سواس کے لیے انھوں نے یہ ترکیب نکالی کہ پگڑی کا ایک سرا پھندا
بنا کر اس کی گردن میں ڈالا اور دوسرا سرا پکڑ کر قریب ہی ایک اونچی جگہ پہنچ کر لگام کا جھٹکا
دینے لگا۔ گھوڑا تھک کر اس قدر بے جان ہو گیا تھا کہ اس جھٹکے سے بھی اس کے جسم میں کوئی
حرکت پیدا نہ ہوئی اور آخر کار وہ دھنستے دھنستے غائب ہو گیا۔ خیر گھوڑے کی جان جانے کا صدمہ
تو مجھے ہونا ہی تھا لیکن اب یہ فکر لاحق تھی کہ دس میل کا صحرائی راستہ کیونکر رات کو طے کیا جائے،
اس لئے مجبوراً مجھے یہ سفر ملتوی کرنا پڑا اور رات بھر بیری میں بسر کرنے کے بعد صبح کو کدورہ پہنچا اور
ساری سرگذشت نواب صاحب کو سنائی اور وہ حسب معمول صرف مسکرا کر رہ گئے۔

یہ تھے میری زندگی کے وہ چار حادثے جن کا تعلق صرف اربعہ عناصر سے تھا لیکن اس سے ہٹ کر
میں کن کن خطروں سے گزرا ہوں ان کی داستان بہت طویل ہے۔ مختصراً یوں سمجھ لیجیے کہ ایک بار ریلوں
کے تصادم میں بھی زخمی ہوا، ڈاکوؤں نے بھی مجھے بارہا گھیر لیا اور شکار کے سلسلہ میں خدا جانے کتنی بار
شیروں نے رحم کھا کر مجھے زندہ چھوڑ دیا۔ ہر چند میں شیر کا شکار کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہوا لیکن
خدا کا شکر ہے کہ وہ بھی کبھی مجھے اپنا شکار نہیں بنا سکے۔ سب سے آخری واقعہ بھوپال کا ہے جب شیر
مجھ سے ایک گز کے فاصلہ پر کامل ایک گھنٹہ تک بیٹھا رہا اور میں گودی (گڑھے) کے اندر چھپا ہوا
کپکپاتا رہا۔

اودھ کی حویلیوں کی
رنگین و پرجلال
داستان
مکتبہ
فسانہ کی پیشکش
شب گزیدہ
قاضی عبدالستار
کے قلم سے
ایک عظیم ناول
ضخامت تقریباً ۱۳۰ صفحات
قیمت ۳ روپئے ۷۵ پیسے
مکتبہ فسانہ عُثمانی منزل دائرہ شاہ اجمل الہ آباد

تامل کہانی

وائیاون

ترجمہ:- ایس۔ ایم۔ حیات بادشاہ
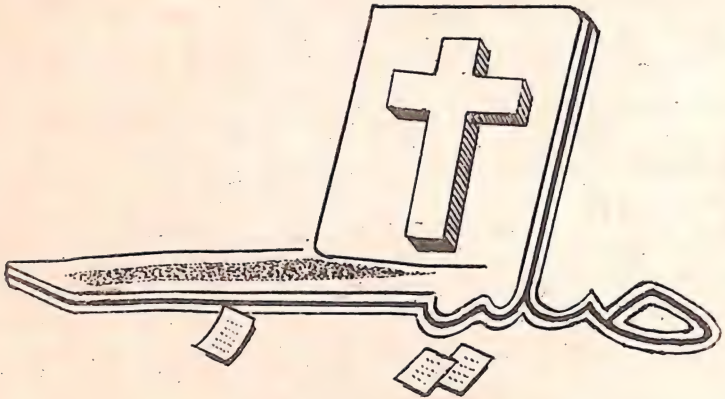
سدانند کی زندگی میں آج تک کوئی ایسا موقعہ نہ آیا تھا جس سے اُن کی ایمانداری کا امتحان لیا جا سکے وہ ایک شریف، سلیم الطبع اور نیک دل انسان تھے۔ وہ عیسائیوں کی قبریں اور تابوت کے صندوق بنانے والی "ہیونس گیٹ" نامی کمپنی میں ملازم تھے۔ "ہیونس گیٹ" ـــــ جنّت کا دروازہ! اس کمپنی نے جنّت کا دروازہ کھولا تھا کہ نہیں یہ تو نہیں کہا جا سکتا لیکن اُس نے سدانند کے لئے روزی کا دروازہ تو ضرور کھول دیا تھا۔ وہاں وہ ملازم تھے۔ آج سے گیارہ سال پہلے اُنھوں نے اس کمپنی کی ملازمت اختیار کی تھی۔ اُن کی تنخواہ ایک روپیہ فی سال کے حساب سے اُن کی افزائش اولاد کے تناسب کے ساتھ ساتھ برابر بڑھتی رہی لیکن نہ جانے کیوں اُن کے آخری لڑکے کی پیدائش کے پانچ سال پہلے ہی سے اُن کی تنخواہ کی رقم میں کوئی اضافہ نہیں کیا گیا۔

ہیونس گیٹ کوئی ولائتی کمپنی نہیں ہے۔ یہ ایک ہندوستانی کمپنی ہے اور اس کے مالک ہیں نیانا سہائم۔ کمپنی کا کاروبار کچھ بڑا نہیں ہے اس لئے سدانند کی ماہوار تنخواہ ساڑھے ستاون روپے کی حد تک پہنچ کر مستقل بن گئی۔ اب اس میں مزید

اضافہ کا کوئی امکان نہ تھا۔

ساڑھے ستّاون روپئے میں آدھ درجن بچوں کے کنبہ کا بوجھ اُٹھانا سدآنند کیلئے آسان نہ تھا۔ وہ بھولے بھالے تو نہیں تھے لیکن مذہبی اور سماجی اصولوں کے خلاف درز کرنے کی انھوں نے کبھی جسارت نہ کی۔ دنیاداری میں رواداری کو دخل بھی کہاں ہو سکتا ہے۔ کسی نے اُن کے ساتھ کبھی کوئی رعایت نہیں کی۔ ان کی سچائی اور ایمانداری کے سبھی مدّاح تھے لیکن کیا وہ درحقیقت سچے اور ایماندار تھے ـــــ؟ اس سوال کا خود ان کے پاس کوئی اطمینان بخش جواب نہ تھا۔ جعل سازی اور دھوکہ بازی کے متعلق انھوں نے اخبارات میں پڑھا تھا۔ بعض حادثات اپنی آنکھوں سے بھی دیکھے تھے۔

تپتی دوپہر ـــــ پونے دو بجے کا وقت تھا۔ دھوپ کافی تیز تھی۔ سدآنند دوپہر کے کھانے سے فارغ ہوکر کمپنی کی طرف نکل پڑے تھے۔ ڈاک خانے کے سامنے سے گذرتے ہوئے اُنھیں معاً خیال آیا ایک خط پوسٹ کرنا ہے۔ خط کو لیٹر بکس میں ڈال کر وہ باہر آرہے تھے کہ اُنھیں ایک بڑھیا دکھائی دی۔

"سنئے! مجھے اپنی بیٹی کے نام کچھ روپئے بھیجنے ہیں۔ ذرا منی آرڈر فارم بھر دیجئے"ـــــ بڑھیا نے سدآنند سے کہا۔

اس کے پروقار چہرہ سے ایک خاص چمک عیاں تھی۔ اس کی عمر پچاس سے زیادہ ہی تھی۔ ایک معمولی سی ساری، گورا رنگ۔ اُس کی آنکھوں میں محبت اور ہمدردی جھلکتی تھی۔

"یہ کونسا بڑا کام ہے! آئیے، کہیں بیٹھ کر منی آرڈر کا فارم بھر دیں"۔ کہتے ہوئے سدآنند آگے بڑھے۔ بڑھیا ان کے پیچھے چلنے لگی۔ اسی لمحہ سدآنند کے دل میں ایک عجب جذبہ نے سر اٹھایا۔ یہ جذبہ اُن حالات کی پیداوار تھا جن میں سدآنند گھرے ہوئے تھے۔ اُن کی پہلی لڑکی کو دیکھ کر شادی کی بات پکّی کرنے کی غرض سے لڑکے والے دو ایک دن میں آنے والے تھے۔ گھر کی حالت کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں آنے والے مہمانوں کو بٹھانے کیلئے ایک اچھی سی چٹائی تک گھر میں نہ تھی۔ تنگدستی اور افلاس کے بھیانک چہرے پر چند گھنٹوں کے لئے ظاہرداری کا پردہ ڈالے رکھنے کے لئے بھی انھیں کم از کم تیس روپئے درکار تھے۔ لڑکے والوں نے اپنے آنے کی اطلاع ایک ہفتہ پہلے ہی دے دی تھی۔ پھر بھی وہ اب تک پیسو

کا انتظام نہ کر سکے تھے۔

سدآنند نے کتنوں کی خوشامد اور منّت سماجت کی لیکن کسی نے ایک پیسہ بھی نہ دیا۔ پہلے ہی اپنے مالک سے جو ستّر روپئے انھوں نے پیشگی لئے تھے ان کی ادائیگی کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔ ایسی صورت میں وہ پھر قرض کا مطالبہ کرنے کی جرأت کیسے کرتے۔

اس رشتہ کیلئے سدآنند نے کئی منّتیں مانی تھیں۔ یہ پہلا رشتہ تھا جو اُن کا دروڈھونڈھتے ہوئے اُن تک آیا تھا۔ ان کی لڑکی اکیس سال کی ہو چکی تھی۔ ایک وقت کے روکھے سوکھے کھانے کے باوجود اس پر جوانی آکر رہی! —— جوانی آئی اور پوری رعنائیوں کے ساتھ آئی —— بیٹی کی جوانی سدانند کیلئے چھاتی کا بوجھ بن گئی تھی۔ اس بوجھ کو اتارنے کیلئے ایک سنہرا موقعہ اب سدآنند کے ہاتھ آیا تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ لڑکے والوں کی خوب آؤبھگت اور مہمان نوازی کی جائے تو شاید غریب گھر کی بیٹی کو اپنی بہو بنانے کیلئے وہ لوگ رضامند ہو جائیں۔ لیکن اس ضیافت کا اہتمام کیسے ہو؟ یہ سوچتے سوچتے اتنے دن گذر گئے۔ آج ——؟

سدآنند ڈاک گھر کے ایک کونے میں پڑی ٹوٹی کرسی پر جا بیٹھے۔ اپنے سامنے کی سیاہی سے اَٹی پرانی میز پر فارم رکھ کر اُنھوں نے اُس بڑھیا کی طرف دیکھا۔ سدآنند کی اس ایک نظر میں کئی مفہوم پنہاں تھے۔ اگر بڑھیا اُن کی آنکھوں میں جھانک پاتی تو شاید اُن میں پنہاں مفہوم اور اُن کے مطالب کو بخوبی سمجھ جاتی۔

"کتنے روپئے بھیجنے ہیں ماں؟"

"پچاس روپیئے!"

اس وقت سدآنند کو اچانک خیال آیا کہ اُنھیں تو صرف تیس روپیوں کی ضرورت ہے۔ منی آرڈر پُر کرنے سے پہلے سدآنند نے بڑھیا سے پوچھا۔

"روپیہ کس کے نام بھیجنا ہے؟"

"اپنی بیٹی کلیرا کو۔ وہ میری اکلوتی بیٹی ہے۔ سیکنڈری ٹریننگ حاصل کر رہی ہے۔ اُس کی چٹھی آئی تھی۔ اُس کے پاس پہننے کیلئے ایک اچھی ساری اور ایک جمپر تک نہیں ہے۔ اسی لئے روپئے بھیج رہی ہوں۔"

"تم یہاں کیا کرتی ہو؟"
"میں گرجا گھر جانے والی سڑک پر پھول موم بتی وغیرہ بیچتی ہوں"
"اس کام میں ایسا کونسا نفع تمھیں ملتا ہے؟ دن بھر بھی اگر بیچو گی تو کچھ پیسے ہی ہاتھ آتے ہوں گے؟"
بڑھیا کی زندگی کے متعلق جاننے کی ایک ہلکی سی خواہش سدآنند کے دل میں پیدا ہوئی۔ گرجا گھر کے قریب اپنے چھوٹے سے کام پر گذارا کرنے والی اس بڑھیا کی ماتا کے جذبے سے وہ بے حد متاثر ہوئے۔
"ہاں! دن بھر بیٹھے رہنے سے کچھ پیسے تو مل ہی جاتے ہیں"
"اچھا! اُسی میں سے بچا کر اتنی بڑی رقم بھیج رہی ہو؟"
جواب میں بڑھیا مسکرائی۔ اُس کی سادہ مسکراہٹ ایک ماں کی ماتا کے وقار کی حامل تھی۔
"کلیرا چار لڑکیوں میں اُٹھتی بیٹھتی ہے۔ دو اچھی ساریاں بھی اُس کے پاس نہ ہوں تو وہ لڑکیاں کیا کہیں گی؟ ہم تو جیسے تیسے زندگی کے دن کاٹ ہی رہے ہیں۔ وہ چار حرف لکھ پڑھ کر آجائے تو ہمارے بڑے دن اچھے دنوں سے بدل جائیں گے!"
——— بڑھیا نے پُرامید لہجہ میں کہا۔
سدانند کی آنکھیں بھر آئیں۔ بڑھیا کے اُس اعتماد سے متاثر ہو کر نہیں جو و
اپنے مستقبل سے وابستہ کئے ہوئے تھی بلکہ اس تصور سے کہ اُنھوں نے پریشان
زندگی میں اپنی چہیتی بیٹی کو نئی ساڑی میں ملبوس کبھی دیکھا ہی نہ تھا اور اُن کی
خواہش شاید کبھی پوری نہ ہو!
سدآنند کے ذہن میں ایک گرمی سی آگئی۔ اُن کی قلیل تنخواہ ——— بیٹی کا بھو
بھالا معصوم چہرہ ——— جھوٹی آس بندھا کر مایوسی کے غار میں ڈھکیل د
والے دوست ——— لڑکے کے گھر والوں کا خط ——— سبھی نے ایک سا
مل کر اُن کے دماغ میں آئی ہوئی گرمی میں اور اضافہ کر دیا۔ اُن کے ارادے ڈا
ڈول ہونے لگے۔ اُنھوں نے اپنے سامنے کھڑی بڑھیا کے چہرہ کو سر اُٹھا کر دیکھ
کہیں اُسے اُن کے دل میں برپا شدید کشمکش کا پتہ تو نہیں چل گیا ہے لیکن اس بڑ

ہرہ تو بھولا بھالا آئینہ کی طرح بالکل صاف شفّاف تھا۔
"اچھا! اپنی بیٹی کا پتہ بتاؤ!"
بڑھیا نے ایک لمبا پتہ بتایا۔ منی آرڈر فارم پُر کرتے وقت سدا آنند کا ہاتھ کانپنے
۔ انھوں نے رقم بھیجنے اور رقم پانے والے کا پتہ انگریزی میں لکھا۔ اتنے ہی میں
پسینہ سے بھیگ گئے۔ پونچھنے سے بھی چہرے کی نمی نہیں گئی۔ اس ذہنی خلفشار میں
سدا آنند سے حروف بھی صاف نہیں لکھے جا سکے۔
"کچھ پیغام بھیجنا ہے؟"
"ہاں! میں کہتی جا رہی ہوں آپ لکھتے جائیے!"
"پیاری کلیرا! ماں مریم کی رحمتیں تم پر نچھاور رہیں۔ تمھاری خواہش کے مطابق
پچاس روپے بھیج رہی ہوں۔ دو اچھی ساریاں خرید لینا۔ میری طبیعت دن بدن گرتی
جا رہی ہے۔ اگر ہو سکے تو دو ایک دن کیلئے چلی آنا۔ یسوع مسیح تمھارے محافظ رہیں۔
تمھاری ماں
میری
سدا آنند بہت مشکل سے فارم پُر کر سکے۔ اُس فارم کو بڑھیا کے ہاتھ میں دینے
والے ہی تھے کہ اچانک کچھ سوچ کر انھوں نے اپنے ہاتھ کھینچ لئے۔
"روپئے مجھے دو۔ میں خود ہی منی آرڈر کئے دیتا ہوں"
"تمھیں کیوں ناحق تکلیف دوں؟"
"اس میں تکلیف کی کیا بات ہے ماں جی! منی آرڈر کے کاونٹر پر بہت بھیڑ ہے
تم وہاں پاس ہی کھڑی رہو۔ رسید لاکر دیدوں گا!"
بڑھیا آگے کچھ نہ کہہ سکی۔
پانچ ہی منٹ میں سدا آنند نے بڑھیا کے ہاتھ میں رسید تھما دی۔
بڑھیا دونوں ہاتھ سے نمسکار کرتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔
سدا آنند شرم سے سکڑ گئے۔ جھلسا دینے والی اس کڑی دھوپ میں دھیرے
دھیرے چلی جانے والی اس بڑھیا کی طرف وہ بہت دیر تک ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے۔
بڑھیا نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ انھیں تعظیم و تکریم کے ساتھ نمسکار بھی کیا۔ اس

سے اُن کی روح پر اور بھی کاری ضرب پڑی۔ کمپنی میں پہنچنے کے بعد بھی سدآنند کا دل بہت دیر تک ڈوبا رہا۔ اُس دن خلاف معمول ان سے حساب میں چند غلطیاں بھی سرزد ہو گئیں۔ رجسٹر میں کاٹ پیٹ دیکھ کر مالک اُن پر برس پڑے۔ سدآنند کی پریشانی کا یہ عالم رہا کہ گھر لوٹتے وقت وہ اپنی پگڑی بھی دفتر ہی میں بھول آئے۔

جب وہ گھر پہنچے تو اُن کی بیٹی سلوی نے انھیں ہاتھ منہ دھونے کیلئے پانی کا لوٹا دیا۔ ہلکی سی چھینٹ کی پرانی ساری اور سفید جمپر پہنے اپنی بیٹی کو دیکھتے ہی سدآنند کی آنکھیں بھر آئیں۔ لیکن انھوں نے اپنے آنسوؤں کو چھپا لیا۔ سلوی کا چہرہ کتنا دلآویز اور پرنور ہے۔ اس کی فطرت کتنی رحمدل اور دلوں کو موہ لینے والی ہے۔ اس کیچڑ میں اس کنول کو اگنا ہی نہیں چاہئے تھا۔ اس نازک چہرے کی ایک محبت بھری مسکراہٹ کیلئے میں اطمینان کے ساتھ جیل تک جا سکتا ہوں۔

اُس رات کو سدآنند نہ اچھی طرح کھانا کھا سکے اور نہ انھیں نیند ہی آئی۔ دوسرے دن صبح ڈاکیہ کا انتظار کرتے ہوئے وہ چبوترے پر بیٹھے رہے۔ ڈاک کو دیکھتے ہی وہ جان گئے کہ وہی منی آرڈر آیا ہے۔ ایک شفیق ماں اپنی چہیتی بچی کے کپڑوں کیلئے پچاس روپئے بھیج رہی تھی۔ اُسے دھوکہ دے کر انھوں نے اپنے ہی نام پر جو منی آرڈر کرلیا تھا وہی منی آرڈر اب آیا ہے۔ یہ چوری بغیر گواہ کے ہو رہی ہے۔ خود ہی روپئے بھیجے اور خود ہی لے رہے ہیں!۔ اس بات کا کوئی گواہ نہیں رہ گیا کہ سدآنند نے ایک بڑھیا کو دھوکہ دیا ہے۔

سدآنند نے منی آرڈر کی رقم پچاس روپئے وصول کر کے ڈاکیہ کی نقلی مسکراہٹ کی مناسب قیمت بھی چکا دی۔ ڈاکیہ نے ایک پوسٹ کارڈ بھی ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔

خط لڑکے والوں کی طرف سے آیا تھا۔ لکھا تھا۔ شگون شُبھ نہ ہونے کی وجہ سے وہ لوگ لڑکی دیکھنے کیلئے ایک مہینہ بعد آئیں گے۔ سدآنند کے دل پر کئی بجلیاں گر پڑیں۔ ناحق انھوں نے اتنا بڑا پاپ کا کام کیا! چوری بھی کیسی؟ ایک لڑکی کے کپڑوں کی چوری! ایک بوڑھی ماں کی ممتا بھری محبت کی چوری!! — سدآنند کا دل بیٹھ گیا۔ اپنے روزمرہ کے خرچ کیلئے انھوں نے چوری نہیں کی تھی

انھوں نے چوری کی اپنی بیٹی کی زندگی کے سُکھ کی خاطر! لیکن اُنھیں اب اُن روپیوں کی ضرورت نہیں تھی۔ سدآنند نے سوچا اُس رقم کو بُڑھیا تک پہنچا دیں۔ اُس کا پتہ اُنھیں یاد تھا۔ اس کی بیٹی کا پتہ وہ ضرور بھول گئے تھے۔ بڑھیا میری کے پتہ پر سدآنند نے پچاس روپئے منی آرڈر کر دیئے۔ نیچے کے کوپن میں اُنھوں نے لکھ دیا کہ وہ غلطی سے کلیرا کے پتہ کی جگہ اپنا پتہ لکھ چکے تھے۔ اب وہ پچاس روپئے میری کو لوٹا رہے ہیں تاکہ وہ اپنی بیٹی کو بھیج دے۔ اس کے بعد ہی سدآنند کے دل کا بوجھ ہلکا ہوا۔

دو دن کے بعد صبح کو جب وہ کمپنی جانے کیلئے گھر سے نکل رہے تھے تو ڈاکیہ نے سدآنند کو آواز دی۔

"آپ کا ایک منی آرڈر لوٹ آیا ہے!"

سدآنند منی آرڈر فارم کو بغور دیکھنے لگے۔ اُس پر چسپاں چھوٹے سے کاغذ پر سرخ روشنائی میں لکھا تھا ـــــ "رقم پانے والا مر گیا!"

اپنی بوڑھی ماں کا آخری دیدار بھی بے چاری کلیرا کو نصیب نہ ہو سکا! میں ہی اس کا ذمہ دار ہوں! اُس کی ماں کے آخری پیغام کو اور اس کی رقم کو میں نے بیچ ہی میں روک لیا۔ ہائے بھگوان! ـــــ سوچتے سوچتے اپنے جرم کا انجام انھیں زیادہ سے زیادہ پریشان کن اور بھیانک نظر آنے لگا۔ ان روپیوں کو کسی نہ کسی طرح کلیرا تک پہنچا دینے کے لئے وہ مضطرب ہو اُٹھے۔

دوپہر کو کھانے کیلئے اپنے گھر جاتے وقت ہی یہ کام ہو سکتا ہے۔ اسی خیال میں وہ سیدھے کمپنی چلے گئے۔ دس بجے کے قریب اُن کا چھوٹا بیٹا ہاتھ میں تھیلی لے کر وہاں آیا۔ اُس کی چال ہی سے سدآنند نے اُس کے آنے کا مقصد تاڑ لیا تھا۔ اُس نے سدآنند کے کان میں دھیرے سے کہا "پتا جی! گھر میں چاول بالکل نہیں ہیں۔ ماں جی نے چاول لے آنے کو کہا ہے"۔

اپنے دل کو مضبوط کر کے سدآنند نے چاول کے دُکاندار کے نام ایک چٹھی لکھ کر بچے کے ہاتھ میں دے دی۔ اُس دُکاندار کو چاول کے جو روپئے ادا کرنے تھے اُنھیں اگلے دن ضرور دے دینے کا ساتویں بار وعدہ کر کے اپنے لڑکے کو دو سیر چاول دے دینے کی درخواست کی تھی۔ لڑکا چٹھی لے کر وہاں سے چلا گیا۔

دوپہر کو اپنے گھر جانے سے پہلے سدآنند نے بڑھیا کے گھر کا پتہ لگایا۔ کسی نے اُنھیں بتایا کہ میری کے مرجانے پر اُس کی بیٹی کلیرا کو تار بھیجا گیا تھا۔ وہ اپنی ماں کا دیدار بھی نہ کرسکی۔ تابوت کے صندوق کو بند کردینے کے بعد وہ یہاں پہنچ پائی تھی۔ سدآنند جب اُس گھر کے اندر داخل ہوئے وہاں چار پانچ عورتیں جمع تھیں لڑکی کی آنکھیں رو رو کر سوج گئی تھیں۔ بھرائی ہوئی آواز میں اپنے ایک پڑوسن سے وہ کہہ رہی تھی :"ماں کیلئے ایک اچھی سی قبر بنوا کر اُس پر صلیب بھی نہ رکھ سکی۔ دادی! مٹی کے ڈھیر پر صرف ایک لکڑی کے ٹکڑے ہی کو صلیب کی جگہ رکھ پائی۔ میں کیسی پاپن ہوں!"

سدآنند کے آنے کی آہٹ سُن کر وہ لڑکی اُٹھ کھڑی ہوگئی۔

"آپ کون ہیں؟ کیا چاہیئے آپکو؟" — اپنی بھیگی آنکھوں کو پونچھتے ہوئے کلیرا نے پوچھا۔

سدآنند کے دل میں آیا کہ اُس سے سب کچھ کہدیں لیکن سچائی کے اظہار سے ملنے والا انعام بے عزتی ہی تو ہوگا۔ وہ بال بچے والے ہیں۔ اگر وہ اپنے جرم کا اقبال کرتے ہوئے معافی بھی طلب کریں تو دنیا انھیں معاف کرنے کیلئے تیار نہ ہوگی۔ اسی لئے انھوں نے جھوٹ ہی کا سہارا لینا مناسب سمجھا۔

"میں ہیونس گیٹ قبروں کی کمپنی کا ملازم ہوں۔ میں نے سنا کہ میری صاحبہ کی موت واقع ہوگئی ہے۔ اُنھوں نے میرے پاس پچاس روپئے رکھ چھوڑے تھے۔ اُس رقم کو لوٹانے آیا ہوں!"

— سدآنند نے کلیرا کے ہاتھ میں پچاس روپئے تھماتے ہوئے کہا۔

وہاں بیٹھی ہوئی عورتوں نے سدآنند کی ایمانداری اور فرض شناسی کی بہت تعریف کی کلیرا کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ وہ احسانمند نظروں سے سدآنند کو دیکھتی رہ گئی۔ وہ خوش تھی کہ اس کے کپڑوں کیلئے جو ماں نے روپئے رکھے تھے وہ اس کی ایک نیک خواہش کی تکمیل کیلئے صرف کرے گی۔ وہ اپنی ماں کی ایک اچھی سی قبر بنوائے گی۔ اُس پر ایک صلیب رکھے گی۔

اپنی ہی کمپنی میں آرڈر دیکر مناسب قیمت پر قبر بنانے اور اُس پر پتھر کا ایک خوبصورت صلیب لگانے کا انتظام سدآنند نے خود کیا۔

کھانا کھانے کیلئے گھر پہنچے تو سدآنند کی بیوی نے اُنھیں بتایا کہ بنئے نے لڑکے کو چاول نہیں دیا۔ وہ پڑوسن کے گھر سے تھوڑا سا چاول مانگ لائی تھی۔ اُس لمحہ سدآنند کو ایسا محسوس ہوا جیسے عزت کی سادی زندگی ہی ایک بڑی صلیب ہے!

(تامل کہانی کا ترجمہ)
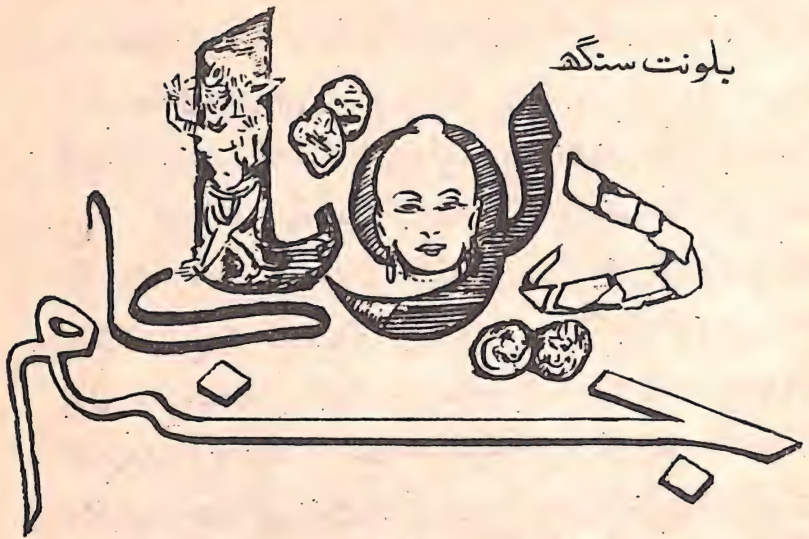
آج سے ہزاروں سال پہلے دریائے نیل اُن شہروں کے قریب سے بہتا تھا جو اس کے کناروں پر آباد تھے۔ ان شہروں کے ایک طرف دریائے نیل کا پانی روانی سے رقص کرتا ہوا بہتا تھا اور اُس کے دوسری طرف لامحدود ریگستان تھا، سوکھا اور بنجر، جس میں کہیں کہیں نخلستان کی ہریالی بھی نظر آجاتی تھی۔

اس ملک کا مرکز "ماذا" ان شہروں میں سب سے خوبصورت اور مشہور تھا۔ شہر کے وسط میں فرماں روائے مصر فرعون کا شاندار محل تھا۔ شہر سے چالیس ہزار قدم دور "طوم" کا بُت خانہ تھا۔ یہ بُت خانہ مصریوں کے آرٹ کا بہترین نمونہ تھا، انگوٹھی میں جڑے نگینے کی طرح خوبصورت۔ بُت خانہ جو بہت بلند تھا دریائے نیل کے کنارے سر اُٹھائے کھڑا تھا۔ اس بُت خانے کے دو حصّے تھے۔ ایک تو روزانہ کی عبادت کے لیے اور دوسرا خاص خاص مواقع کے استعمال کے لیے۔ لاتعداد بھیڑوں، بکریوں کے علاوہ بُت خانہ سے ملی اُفتادہ زمین پڑی تھی جس سے بُت خانہ کو اچھی آمدنی ہو جاتی۔ بُت خانہ سُرخ پتھروں کا بنا تھا اور اُس کے چاروں طرف بھاری سلوں کا دور تک پھیلا ہوا چبوترہ تھا۔ اس کی خوبصورتی اتنی دلکش تھی کہ دور دور سے انسانوں کا ایک جم غفیر اسکی طرف کھنچتا چلا آتا اور گن گاتا واپس ہوتا۔

اس بُت خانے کی خاص چیز اس کی اونچی اونچی محرابیں تھیں۔ جنھیں دیکھنے کے لیے بادشاہوں

کو اپنے تاج ایک ہاتھ سے تھامنے پڑتے تھے۔ اس کے چوڑے، اونچے پھاٹک پتھر کی چوکور سلوں کے بنے ہوئے تھے جو اس قدر کاریگری سے تراشی اور نصب کی گئی تھیں کہ یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ الگ سے لگائی گئی ہیں۔ ان پتھروں پر دیویوں اور دیوتاؤں کی کہانیاں کندہ تھیں۔ سب سے بڑا پھاٹک اتنا چوڑا تھا کہ سولہ رتھ پہلو بہ پہلو ایک ساتھ ہی اس میں سے گذر سکتے تھے۔

بُت خانے تک پہونچنے کے لیے سیڑھیوں کا راستہ بنا تھا، جس کے دونوں طرف مختلف دیوتاؤں میں ایک گدھ کی چونچ والا دیوتا تھا جس کا نام 'تمٹے' تھا۔ مینڈھے کے سر والا دیوتا 'کھنوج' بھی وہاں پر موجود تھا۔ وہاں شہرۂ آفاق دیوی 'آئسس' کا مجسمہ بھی تھا اور اس کے شوہر، بھائی، بیٹا اور باپ 'اوسارس' بھی اس کے پاس کھڑے تھے۔ سورج کا دیوتا 'را' بھی وہاں موجود تھا جس کا چہرہ اُلو کا تھا لیکن جسم انسان کا سا۔ اُن کے علاوہ وہاں 'اورس' اور اس کے چار بیٹوں کا مجسمہ بھی تھا۔ ان کی شکلیں عجیب تھیں اور عوام میں ان کے بارے میں تعجب خیز کہانیاں مشہور تھیں۔ جہاں پر سڑک ختم ہوتی تھی وہیں سے بت خانہ کی ایک سو تیس چمکتی ہوئی سیڑھیاں شروع ہوتی تھیں سیڑھیوں کے دونوں طرف اونچے اونچے ابوالہول (سفنکس) کھڑے تھے۔ جنھیں دیکھ کر ڈر لگتا تھا۔ وہ سیڑھیاں ایک بڑے گلزار میں پہنچ کر ختم ہو جاتی تھیں۔ اس کی چھت ستر بھاری ستونوں پر رکھی ہوئی تھیں۔ وہ ستون اتنے ہموار اور چکنے تھے کہ ایک چیونٹی بھی اُن پر چلے تو پھسل کر نیچے آگرے۔ گلزار میں ایک چبوترہ تھا جس پر 'طوم' کا مجسمہ تھا۔ طوم سب دیوتاؤں میں اونچا تھا۔ وہ ساری فطرت کا خالق تھا اور بغیر اس کی اجازت کے ایک تنکا بھی نہیں ہل سکتا تھا۔ خاص خاص موقعوں پر اس میں ہزاروں شائقین سما جاتے۔

بُت خانے کے دوسرے حصے میں طوم کی محبوبہ 'رازانا' کا مجسمہ تھا۔ یہ مجسمہ سنگ تراشی کا بہترین نمونہ تھا۔ کتنے ہی سنگ تراشوں نے اپنی ساری زندگی اس مجسمہ کو بنانے، نکھارنے اور بے مثال بنانے کے لیے وقف کر دی تھی۔ اس کا چہرہ بے داغ تھا اور پاکیزگی جھلکتی تھی۔ اس مجسمہ کے دونوں طرف سے چکر کھاتی ہوئی سیڑھیاں نیچے دالان تک چلی جاتی تھیں، جس کے دائیں بائیں دو عمارتیں بنی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک میں فرعون اور اس کے خاندان کے افراد یا وزیر اور معزز عہدیداران بھی بیٹھ سکتے تھے۔ دوسری طرف بیسیوں پجاری اور ہزاروں زائرین کے بیٹھنے کی جگہ تھی۔

اب ایک جلسہ ہونے جا رہا تھا۔ ملک کے دور دراز حصوں سے زائرین پہنچ چکے تھے۔ شہر کی سب سرائیں بھر چکی تھیں۔ اکیس دن تک منتر پڑھے گئے۔ پجاریوں کے دیوتاؤں کی تعریف میں

بھجن گائے گئے اور پھر سات بھیڑوں کو ان کے نام پر قربان کر دیا گیا۔ ان کا خون بہہ کر دالان کے وسط میں بنے ہوئے تالاب کے پانی میں گھل مل گیا۔ تیرہ جنبی ہوئی کنواریوں نے اس پانی میں غسل کیا اور صبح سویرے رقص کرنے کے بعد انھوں نے نیل میں کنول کی ادھ کھلی کلیاں بہا دیں۔

اس عہد کے مصریوں کو یقین تھا کہ طوم کی محبوبہ راز انا، ان کی اس پرستش کو قبول کرتی ہے اور پھر اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے ہیں اور ان آنسوؤں کے زور سے دریائے نیل میں سیلاب آجاتا ہے اور اس سیلاب کے ساتھ ہی زرخیز مٹی بہہ کر آتی جو میلوں تک دریائے نیل کے کنارے کنارے پھیل جاتی۔ تب اس زمین میں اناج کے پودے اُگتے اور "طوم" کی اجازت سے سورج کا دیوتا را، ان فصلوں کو پکاتا۔

اس وقت تک سردیوں کا موسم ختم ہو جاتا سوکھی شاخیں ہری ہو جاتیں۔ ہوا میں کلیاں مہکتیں اور پھول کھل اُٹھتے۔ جیپا مصر کا بڑا پجاری تھا۔ اس کا عہدہ بہت اونچا تھا۔ اور اس کا علم لامحدود تھا۔ اُس کا حکم ٹالا نہیں جا سکتا تھا۔ یوں بھی وہ بہت بارعب انسان تھا۔ جدھر سے وہ گزرتا لوگوں کے سر احتراماً جھک جاتے۔ مذہبی معاملات میں اس کا حکم اٹل رہتا حتیٰ کہ خود فرعون بھی دخل نہیں دیتا تھا۔ اپنی موت کے بعد ہونے والا جانشین بھی وہ خود ہی چُنتا تھا۔

شام ہو چکی تھی اور ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنیں دریائے نیل کے پانی میں گھل مل رہی تھیں۔ جیپا بُت خانے کے ایک چھوٹے کے کمرے کے سامنے برآمدے میں کھڑا تھا۔ دریا کے بالکل پاس ہونے کی وجہ سے یہ جگہ ٹھنڈی رہتی تھی اس لیے گرمی کی دوپہر وہ یہیں گذارتا تھا۔ اس وقت اس کا لبادہ سورج کی دم توڑتی کرنوں میں جگمگا رہا تھا۔ وہ سورج کے ڈوب جانے کا انتظار کر رہا تھا تاکہ وہ دریا کے کنارے کنارے ٹہلتا ہوا فرعون کے محل تک پہنچ جائے۔ یہ پوجا کا آخری دن تھا اور اس آخری شام کو فرعون اپنے وزیروں اور خاص عہدیداروں کو دعوت دیتا تھا۔

اس وقت جیپا گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا کیونکہ وہ اگلی صبح کو مصریوں کے سامنے ایک نئی چیز رکھنا چاہتا تھا۔ جو مصر میں زندگی کی لہر دوڑا دے گی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جب وہ اپنا نیا نقطۂ نظر پیش کرے گا تو مصری اس کا خیر مقدم کریں گے یا نہیں؟

بُت خانوں کے مجاور چراغوں میں تیل ڈال رہے تھے اور ہر چراغ میں تیل سے بھیگی بتی رکھی جا رہی تھی۔ جب شام ذرا کجلانے لگی تب ہوا میں بھی ٹھنڈک پیدا ہو گئی۔ اس کی کھوئی کھوئی نظریں سطح نیل پر جمی ہوئی تھیں۔

پُرانے زمانے میں مصری خوب تگڑے اور مضبوط ہوتے تھے لیکن جیپا کی صحت اور شخصیت ایسی تھی کہ وہ لاکھوں میں الگ اور انوکھا نظر آتا تھا۔ حالانکہ ان دنوں داڑھی اور سر منڈوانے کا رواج تھا۔ لیکن بڑے پجاری نے اسیریا کے بادشاہ کی طرح لمبی اور گھنگھریالی داڑھی رکھی تھی جو اس کے ناف تک پہنچتی تھی۔ وہ اکھرے بدن کا طاقتور انسان تھا۔ اس کے بدن کا ڈھانچہ لمبا چوڑا اور مضبوط تھا۔ اس کے بدن کی نسیں اوپر کو اُبھری ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھیں چمکدار اور ابرو چوڑے اور لمبے تھے۔ دونوں ابروؤں کے بیچ دو گہری لکیریں اس کے ماتھے پر اُبھرتی تھیں اور بہت اوپر تک چلی گئی تھیں۔

شام اور گہری ہو گئی تو ایک خدمت گار نے آکر اس کے سامنے سر جھکا دیا۔ بڑے پجاری نے ایک نظر اس خدمت گار پر ڈالی اور دل ہی دل میں کہا کہ ابھی تو دعوت شروع ہونے میں کافی دیر ہے اس لیے کیوں نہ وہ پیدل روانہ ہو تاکہ کچھ وقت کٹ جائے۔ چونکہ بُت خانہ اونچے مقام پر واقع تھا اسی لیے وہ اپنے سامنے پھیلے شہر کو آسانی سے دیکھ سکتا تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے ہزاروں مکان تھے۔ گول، چوکور، لمبے، بڑے، چھوٹے ابھرتے اور چمکتے ہوئے مکان۔ جس میں بل کھاتی گلیاں کیچوے کی طرح دکھائی دیتی تھیں۔ کہیں کہیں پام اور کھجور کے پیڑوں کے جھنڈ سر اُٹھائے کھڑے تھے۔ شہر کے لوگ شام کو گھروں سے باہر نکل آتے اور تفریح کی خاطر دریا کے کنارے ڈیرے ڈال دیتے۔ بڑے بڑے تجارتی جہازوں کے علاوہ امیر سوداگروں کی دُلہن جیسی سجی سجائی کشتیاں بھی ہچکولے لیتی نظر آتی تھیں۔ اس وقت الغوزوں کی تانیں اڑتیں اور خوبصورت لڑکے اور نوجوان لڑکیاں ان کے ساتھ ساتھ رقص کرتے۔ رنگین چپو ایک قطار میں ساتھ ساتھ پانی کی سطح سے اوپر اُٹھتے اور نیچے جاتے لیکن کوئی آوازہ سُنائی دیتی۔ دریا کے کنارے بیٹھے لوگوں کے کانوں میں چپیروں کے جیتے گیت لہروں کے ساتھ چل کر پہنچ جاتے۔ دوسری طرف سیاہی کی ردا میں لپٹا شہر یوں دکھائی دیتا تھا جیسے وہ بھی ان گیتوں اور سازوں کے ہلکے سُروں سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔

جیپا نے خادم کو حکم دیا کہ اس کی پالکی 'میشیتی' کے دوسرے کونے تک پہنچا دی جائے وہاں تک وہ پیدل ہی جائے گا۔ پھر آگے محل تک کا راستہ پالکی میں طے کرے گا۔ 'میشیتی' دریا کے کنارے بسی ہوئی تفریح گاہ کا نام تھا۔

حکم پا کر سولہ اشخاص کندھے پر پالکی اُٹھا کر 'میشیتی' کی طرف بڑھے۔ ان کے علاوہ دوسرے خادموں کو بھی پالکی کے ساتھ جانے کا حکم ملا۔ صرف ایک خادم جو پجاری کی چپل اٹھائے ہوئے تھا ٹھہرا رہا

جب بڑا پجاری نپے تُلے قدموں سے سیڑھیاں اُتر رہا تھا تب زائرین، غلاموں اور کنیزوں نے اسکے سامنے سر جھکا دیا۔ وہ پورے جلال کے ساتھ باہر والی بڑی محراب تک جا پہنچا وہاں خادم نے آگے بڑھکر چپل اس کے پاؤں کے قریب زمین پر رکھ دی۔

اس وقت سارے شہر پر ہلکی سی دُھند چھاگئی تھی اور کچھ ستارے آسمان پر ٹمٹمانے لگے تھے۔ اپنے ہاتھ میں سنہرا عصا لئے وہ بڑی تمکنت کے ساتھ دھیرے دھیرے قدم بڑھاتا ہوا چل دیا۔ دو خوبصورت لڑکے اس کے لمبے لبادے کے دونوں کونے اُٹھائے اس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ جب وہ شہر کے پاس سے گذرا تو عورتیں اپنے اپنے دروازوں کے ادھ کھلے کواڑوں میں سے جھانکنے لگیں۔ کیچڑ اور مٹی سے اٹے ہوئے چھوٹے چھوٹے لڑکے لڑکیاں اپنے اپنے کھلونے گڑیاں، کپڑے کے بنے گیند اور گولیاں چھوڑ کر عظیم پجاری کو دیکھنے لگیں۔ وہ اپنے پیٹ یا بغل کھجاتے ہوئے تعجب بھری نگاہوں سے اسے تب تک دیکھتے رہے جب تک وہ ان کی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوگیا۔ کسان لڑکے، جن کے بالوں میں دن بھر کی دھول جمی تھی گانا گاتے اور بانسری بجاتے اپنے بیلوں اور گدھوں کو ہانکتے شہر سے باہر پھیلے ہوئے کھیت سے واپس آرہے تھے۔ شہر کے باہر کھانے پینے کی چھوٹی موٹی دکانیں تھیں اور بیچ بیچ میں بڑھئیوں، لوہاروں اور کپڑے والوں کی دکانیں بھی موجود تھیں۔

دھیرے دھیرے جیپا 'میشیتی' کے قریب پہنچا 'میشیتی'، نیل کے کنارے قریب پون میل لمبا چبوترہ تھا۔ یہ چبوترہ پتھر کی بڑی بڑی سلوں کا بنا ہوا تھا۔ بیچ بیچ میں کیاریاں چھُٹی ہوئی تھیں جن میں ہری بھری گھاس لہلہاتی اور رنگ برنگے پھول کھلے تھے۔ ان کے علاوہ پام اور کھجور کے پیڑوں کے جُھنڈ بھی بیچ بیچ میں دکھائی پڑتے تھے۔ اور ان تینوں کے آس پاس خوبصورت جھاڑیاں تھیں جن سے ہلکی ہلکی خوشبو آتی رہتی تھی۔ جگہ جگہ پتھروں کی بنی بنچیں بھی تھیں وہاں سینگ کے بنے، لال شراب سے چھلکتے پیالے بھی بکتے تھے اور کھانے کے لیے سرکے میں تیرتی ہوئی مچھلیاں اور بھُنی ہوئی مسلّم بطخیں بھی ملتی تھیں۔

یہاں سب ہی شہری آتے تھے اور گھُل مل کر تفریح کا لطف اٹھاتے۔ اس وقت چھوٹے بڑے کا کوئی سوال نہیں اُٹھتا تھا۔ بربط کے تاروں سے نکلتے ہوئے نغمے گئی رات تک ہوا میں تیرتے رہتے۔ دالفوزروں، کی تانیں الگ اپنا جادو جگاتیں۔ دلکش اور چنچل جوانیاں اپنے رقص سے دیکھنے والوں کے دلوں کو گرماتیں۔ چاند کی دھیمی جادو بھری روشنی میں ان کی چھاتیاں یوں دکھائی دیتیں جیسے دریائے نیل کی سطح پر تیرتے ہوئے بگلے۔

جیپلنے کبھی اس دلکش جگہ پر جانا اچھا نہیں سمجھا۔ کبھی کبھی جب اس کا ادھر آنا ہوتا
تب وہ چپ چاپ پاس سے گذر جاتا۔ لطف اندوز ہونے والے اور شراب کے رسیا جب اُسے
دیکھتے تو سب کام چھوڑ کر اپنے سر جھکا دیتے۔ جب تک وہ ان کی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا
ان کی یہی حالت رہتی۔ حسین اور شوخ لڑکیوں کی ٹولیاں اس تفریح گاہ میں آتیں۔ وہ
چمکتے ہوئے تیز رنگ کی ازاریں اپنی کمر کے گرد لپیٹے رہتیں جن پر جڑاؤ کلپ لگے ہوتے تھے۔ امیر
عورتیں گلے میں ایک عجیب طرح کا کپڑا باندھے ہوتیں جو پیاز کے چھلکے سے بھی مہین
ہوتا تھا۔ ان کی کلائیاں چوڑیوں سے سجی ہوتیں اور پاؤں میں پازیب ہوتے تھے۔ اور
ان کے نرم و نازک، لچکدار جسم بھرپور چھاتیوں کے بوجھ تلے بل کھا کھا جاتے تھے۔ اگر کوئی
مخمل جیسے لبوں والی لڑکی پریشان زلفوں کو ہاتھ سے ہٹانے لگتی تو یوں معلوم ہوتا جیسے
بجلی کوئل جیسے کالے بادلوں میں گھل مل گئی ہو۔ نوجوان لڑکے یاسمین کے پھولوں کے گجرے
کلائیوں پر لپیٹے، ہونٹ بانسریوں پر جمائے بڑی بیباکی سے ان لڑکیوں کو دیکھا کرتے۔
شہر کی حسین رقاصاؤں میں سب سے خوبصورت اور ہنرمند رقاصہ مشیرا تھی۔ یہی
وہ رقاصہ تھی جسے دوسری صبح دیوی 'رازانا' کے سامنے رقص کرنا تھا۔ وہ اپنے گھنے بالوں
کے بیچوں بیچ سیدھی مانگ نکالتی تھی اور اس کے دو حصوں میں بٹے ہوئے گھنگھرالے
بال جیسے لہراتے ہوئے جھرنے تھے۔ اپنے ماتھے پر وہ سونے کا ٹیکا پہنے رہتی جس میں
طرح طرح کے رنگ برنگے قیمتی پتھر جڑے ہوئے تھے۔ جب چاند کی روشنی اسکے کانوں میں
جھولتی ہوئی بالیوں پر پڑتی تو ان بالیوں کا سفید عکس اس کے چہرے پر پڑتا جس سے اُس کی
خوبصورتی میں چار چاند لگ جاتے۔ بھڑکتے ہوئے شعلے جیسے چہرے والی اس رقاصہ کی کنواری
چھاتیاں اُلٹے رکھے ہوئے ان مٹی کے پیالوں کی طرح تھیں جنھیں چھو کر کسی نے آج تک نہیں جانا
کہ وہ اندر کیا چھپائے ہوئے ہیں۔

جب جیپا اس چبوترے کے پاس سے گذر رہا تھا تو ہمیشہ کی طرح گانا بجانا بند
ہو گیا اور لوگوں نے سر جھکا لیا۔ وہ جانتے تھے کہ یہ بڑا پجاری رُکے گا نہیں اور تھوڑی ہی
دیر بعد وہ اپنا پروگرام پھر سے شروع کر سکیں گے۔ چبوترے سے پرے ایک پاگل سا
سنیاسی بیٹھا ہوتا تھا جس سے بات کرنے کے لیے پجاری کبھی کبھی رک جایا کرتا۔
یہ سنیاسی اپنی ہی دھن میں مست رہتا اس کا بدن اکہرا تھا اور اس کے بال

آپس میں بُری طرح اُلجھے ہوئے تھے۔ موسم زیادہ تر گرم رہنے کی وجہ سے بہت زیادہ کپڑے کی ضرورت نہیں رہتی تھی۔ سنیاسی تو صرف ایک لنگوٹ میں گذارا کرتا تھا۔ ہر روز صبح وہ کھجور کے پیڑوں کے جھنڈ تلے شہر کی طرف مُنہ کرکے بیٹھ جاتا۔ اس کے سامنے ایک بڑا سا مٹی کا پیالہ رکھا رہتا تھا جس میں آنے جانے والے کھانے کی چیز رکھ دیتے تھے۔ جب وہ دیکھتا کہ اس کے پیٹ بھرنے کے لیے پیالے میں کافی کھانا آگیا ہے۔ تو وہ الگ کرکے پیالے کو اُلٹ دیتا اور خود شہر کی طرف پشت کرکے بیٹھ رہتا۔ وہ بہتے ہوئے دریا کی لہروں کو دیکھ کر ہنستا رہتا۔ اس کے ماتھے پر کبھی بل تک نہ آیا تھا۔ وہ کس بات پر ہنستا تھا یہ کسی کو بھی معلوم نہ تھا۔ اس کی من موجی طبیعت کا بھید بھی کوئی نہ جانتا تھا۔ عوام میں اس کے بارے میں طرح طرح کی افواہ پھیلی ہوئی تھی۔ لیکن اکثر لوگ اسے پورا نہیں تو آدھا پاگل ضرور سمجھتے تھے۔

سارے مصر میں وہی ایک انسان تھا جو بڑے پجاری کی طرف کوئی خاص دھیان نہیں دیتا تھا اور نہ عزت و توقیر سے پیش آتا تھا وہ اسے ہمیشہ تو کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ جب فرعون کو اس کی اس بے ادبی کا پتہ چلا تو اُسے بہت غصہ آیا اور اس نے بگلے کو سزا دینی چاہی لیکن بڑے پجاری نے اُسے ایسا کرنے سے منع کر دیا۔ اس سر پھرے فقیر کو ان باتوں کا کچھ پتہ نہیں تھا نہ ہی اسے کسی کی پرواہ ہی تھی اور نہ ہی اس نے اپنا رویہ بدلا تھا وہ جیپا کے سامنے زمین پر ٹانگیں پھیلائے بے وجہ ہنستا رہتا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بڑی بے ادبی کی بات تھی لیکن خود بڑا پجاری بھی اس کی اس بے ادبی کو چُپ چاپ برداشت کر لیتا تھا۔ کبھی کبھی وہ بگلا جیپا سے یہ کہتا" تو جانتا ہے، تیری آنکھوں کی یہ روشنی اس دنیا کی روشنی نہیں ہے۔"

اس وقت جیپا چلتے چلتے اس پاگل کے پاس پہنچا تو رُک گیا۔ فقیر کا پیالہ اوندھے مُنہ اس کی پیٹ کی طرف پڑا تھا۔ اور خود شہر کی طرف پیٹھ پھیرے دریا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹیں کھیل رہی تھیں۔ اس کے لمبے، اُلجھے بال ہوا میں لہرا رہے تھے سنیاسی نے بڑے پجاری کی طرف منہ کیے بغیر کہا" سُن رے بڑے پُجاری مجھے تجھ سے ایک سوال پوچھنا ہے"۔ پھر پجاری کے جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے پوچھا" مجھے بتا کہ تیرے شہر کے لوگ مجھے ہنسنے کیوں نہیں دیتے ؟۔ وہ بڑھئی جو لکڑی کو پتھر سے ہموار کرتے ہیں، وہ لوہار جو بھٹیوں کے سامنے بیٹھ کر گرم لوہے کو ہتھوڑی سے کوٹتے ہیں۔ وہ کسان جو بھولی بھولی مشکوں میں پانی بھر بھر کر اپنے کھیتوں کو سینچتے ہیں۔ وہ پجاری جو طوم کے بیکار بے حس مجسمے کے سامنے پیشانی رگڑتے

ہیں اور وہ امیر جو انجیر کے پیڑوں کے نیچے اپنے چھوٹے چھوٹے تالابوں میں نہاتے ہیں وہ سب مجھ سے پوچھتے ہیں، بے وقوف بتا تو کس بات پر ہنستا ہے۔

جیپا مسکرایا، وہ کچھ جواب دینے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ وہ فقیر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے اپنا خالی پیالہ ہاتھ میں پکڑا اور بڑے پجاری کا جواب سُنے بغیر وہاں سے چل دیا۔

کچھ دور پر بانسریوں، بربطوں اور دفوں کا نغمہ ہوا میں تحلیل ہو رہا تھا۔ من چلے لوگ اپنی تفریح میں مشغول تھے۔ گیتوں کے بول آسمان تک پہنچنے والے قہقہے، ہاتھوں کی تالیاں، خوشی سے بھری ہوئی چیخیں سارے ماحول پر چھائی ہوئی تھیں۔ دھندلی روشنی میں اس فقیر کی پرچھائیں ریت کے ٹیلوں کے پیچھے گم ہو رہی تھیں۔ جب اندھیرے نے روشنی پر فتح پالی اور بڑی بڑی چمگادڑیں اپنے بڑے پر پھیلا کر ہوا میں ہچکولے لینے لگیں اور کبھی کبھی کوئی چمگادڑ بڑی تیزی سے اِدھر سے اُدھر نکل جاتی تب بڑے پجاری نے اپنے معتقدوں کو جو کچھ فاصلے پر کھڑے تھے اپنے پاس بُلایا وہ آئے اور اسکے سامنے سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔ اس نے اپنے چپل اتارے اور پالکی میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔ ایک خادم اُس کے چپل اٹھا کر پیچھے چل پڑا۔

کسان ہل بیل لئے کھیتوں سے واپس ہو رہے تھے۔ چرواہوں کے لڑکے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ دوڑ کر کیچڑ کے گولے پھینک رہے تھے۔ غریب لوگ اپنے سامنے لکڑی کے تختے پر مہرے رکھے بارہ کھٹال کھیل میں مگن تھے اور کچھ لڑکے اپنے پاؤں کے بل بیٹھے انگلیوں کا کھیل کھیل رہے تھے۔ ان میں سے کوئی اپنا ہاتھ پیچھے سے آگے لاکر ہوا میں بڑے زور سے ہلاتا تب دوسرے کو ان انگلیوں کی تعداد بتانی پڑتی تھی۔ کئی جگہ گلی کے موڑ پر کوئی کہانی کہنے والا کسی ابوالہول کے ساتھ پیٹھ لگائے اپنے بازو ہوا میں ہلاتا، آنکھوں کی پتلیوں کو ہلاتا، آنکھوں سے اشارہ کرتا کوئی پیار کی کہانی سُناتا نظر آجاتا تھا۔ اپنے کاموں سے فرصت پاکر لوگ کہانی کہنے والے کے چاروں طرف کہانی سُننے کے لیے جمع ہو جاتے تھے۔

جیسے جیسے بڑے پجاری ان مہذب اور خوبصورت مصریوں کو دیکھتا اتنی ہی اسکی پریشانی بڑھتی جاتی۔ چند ہی پہر بعد وہ صبح ہونے والی تھی جب کہ ایک بہت بڑی حقیقت سے وہ انھیں آگاہ کرانے جا رہا تھا۔ جسے سُن کر شاید وہ اُسے مار کر اس کا گوشت کتّوں کے آگے ڈال دیں۔ وہ سوچنے لگا کہ کیا یہ لوگ اس عظیم حقیقت کو سمجھ سکیں گے اور اتنے ہی اوپر

اُٹھ سکیں گے جتنا کہ وہ چاہتا تھا۔

وہ اس سوچ میں اس وقت تک ڈوبا رہا جب تک فرعون کے محل کے آگے پہنچ نہیں گیا۔ سات نقارچیوں نے نقارے بجا کر اس کے آنے کی خبر پہنچائی۔ اس کے استقبال کے لیے خود فرعون اور بڑے بڑے عہدیداران آئے۔ فرعون اونچے قد کا خوبصورت جوان تھا۔ اس وقت وہ شمالی و جنوبی مصر کا ملا ہوا تاج پہنے ہوئے تھا۔ اس کے کان سونے کے بنے ہوئے عقاب کے پروں تلے چھپے ہوئے تھے۔ ان سُنہرے پروں کے نیچے سے دو ریشمی پلو اس کے چوڑے کندھوں پر لہرا رہے تھے۔ اس کی گردن میں آدھے سینے کو ڈھکے ہوئے ایک چوڑی ہنسلی تھی جس میں قیمتی پتھر جڑے ہوئے تھے۔ اس کے کندھوں پر ململ کا لبادہ تھا جن کے پلے نیچے لٹک رہے تھے۔ پھولدار لنگی ٹخنوں تک جھول رہی تھی۔ کمر میں سونے کا کمر بند تھا جس میں اڑسا ہوا بہت ہی سفید اور باریک کپڑا لمبی لمبی تہوں کی شکل میں پانی کے جھرنے کی طرح اس کے گھٹنوں تک پہنچتا تھا۔ سونے کے عقاب کی دُم پیچھے کی طرف کمر بند کے سہارے لٹکی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں شاہی عصا (رائل سپٹر) تھا اور اس کے پیچھے پیچھے ایک خادم نیل اُٹھائے چلا آ رہا تھا۔ دو خادم شتر مرغ کے بنے بڑے بڑے پنکھے جھل رہے تھے۔ اور اس کا پالتو شیر کا بچہ جماہیاں لیتا ہوا اس کے ساتھ قدم بقدم چلا آ رہا تھا۔

جب بڑا پجاری پھاٹک میں داخل ہوا فرعون نے آگے بڑھ کر اس کے لہراتے ہوئے لمبے لبادے کا کونا اپنی آنکھوں سے لگایا۔ معزز پجاری نے اپنی پانچوں انگلیوں کو گلاب میں ڈبو کر فرعون کے ماتھے کو چھوا۔ بڑے بڑے عہدیداران، ملازمین اور دربار کی کنیزوں نے گھٹنوں کے بل جھک کر بڑے پجاری کی دعائیں لیں۔

محل کے ایک بڑے دالان میں دعوت کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس کے ایک کونے میں بیٹھی ایک خوبصورت جوان لڑکی ایک آدمی کے برابر اونچے بربط کے تاروں کو اپنی انگلیوں سے چھیڑ رہی تھی۔ دیواروں پر مختلف رنگوں سے بنی تصویروں میں فرعون کی زندگی کی جھلکیاں دکھائی گئی تھیں۔ ان میں سے ایک میں اُسے شیر ببر کا شکار کرتے دکھایا گیا تھا۔ وہ آندھی کی سی تیزی سے چلنے والے رتھ پر چلا چڑھائے کھڑا تھا۔ اس کے پیچھے نیزے باز ہاتھ میں نیزے لئے کھڑے تھے۔ ایک طرف تصویر میں وہ کسی مجرم کو بالوں سے پکڑ کر دبائے ہوئے تھا۔ اس کے ہاتھ میں نکیلے پتھر کی کدال تھی جس کا دستہ لکڑی کا تھا جسے ہوا میں اُٹھائے وہ مجرم

کو موت کی سزا دینے کی دھمکی دے رہا تھا۔ ایک دوسری تصویر میں وہ بڑی شان اور رعب کے ساتھ تخت پر بیٹھا دکھایا گیا تھا۔ اس کے سامنے دُور دُور کے ملکوں کے سفیر تحفے لئے کھڑے تھے۔ ایک جگہ پر وہ اپنے جانوروں کی تعداد گن رہا تھا۔

بہت ساری بڑی مشعلیں جل رہی تھیں۔ اس دالان کو اتنا سجایا گیا تھا کہ سارا ماحول جھلمل جھلمل کر رہا تھا۔ عورتوں کے رنگین لباس روشنی میں اپنی الگ بہار دکھا رہے تھے۔ بالکل ننگے یا ادھ ننگے غلام اور کنیزیں ہاتھ میں مشعلیں لئے اِدھر سے اُدھر گھوم رہے تھے۔ نازک اور خوبصورت لڑکے بانسری کی میٹھی تانیں اُڑاتے گھوم رہے تھے۔ نقال اور بازی گر مہمانوں کی تفریح کے لیے تیاریاں کر رہے تھے۔

فرعون، اُس کی رانی اور معزز پجاری کے بیٹھنے کے لیے تین دیوان خاص خاص طور پر سجائے گئے تھے۔ باقی لوگوں کے بیٹھنے کے لیے بڑے بڑے رنگین نشست گاہوں کا انتظام کیا گیا تھا۔

جیسا کہ وہاں کا رواج تھا دعوت سے پہلے ایک ممی سب مہمانوں کے سامنے سے گھمائی گئی۔ ایک گویئے نے بربط کے تاروں کے نغموں پر ایک بہت ہی درد ناک گیت گانا شروع کیا، جس میں انسان کی لافانی زندگی اور ان بہادروں کا تذکرہ تھا جو اب اپنی اپنی خواب گاہوں میں ہمیشہ کی نیند سو رہے تھے۔ ان میں سے کچھ سپاہی اتنے بہادر اور اتنے قوی تھے کہ ان کے نام ہی سے دُنیا تھر تھر کانپتی تھی اور ان کے پاس بے انتہا دولت تھی۔ اب ان کے جسم مٹی ہو گئے تھے۔ صرف ان کی بہادری کے دُھندلے کارنامے انسانوں کے ذہن میں باقی رہ گئے تھے۔ بڑے بڑے فاتحوں کا نام اس طرح مٹ گیا تھا جیسے وہ کبھی پیدا ہی نہ ہوئے ہوں۔ وہ درد ناک گیت کچھ اس طرح سے ختم ہوا۔

کاش، کوئی روح آ کر بتا سکتی۔
کہ مرنے کے بعد اس پر کیا گذری
تا کہ مرنے سے پہلے سکون مل سکتا
کہاں ہیں وہ جو مر چکے ہیں یہ کوئی نہیں جانتا۔
کیا ہی اچھا ہو اگر جینے والے مرنے والوں کو بھلا ہی دیں
جئیں اور خوش رہیں اپنے ہاتھوں پر چندن کی دھول ملیں
مایوس نہ ہوں، کھائیں، پئیں اور جو دل میں آئے کریں

زندگی کے آخری اُداس لمحوں تک
انھیں یاد مت کرو
کیونکہ جو مر چکا سو مر چکا
اُن کے لئے تو ساری دُنیا ہی مر چکی
اس لئے جی بھر کر موج اُڑاؤ
کیونکہ یہ زندگی تمھارے ساتھ تمھاری قبر میں جانے والی نہیں ہے
اور کبھی مت بھولو کہ مر کر انسان واپس نہیں آ سکتا۔۔۔۔۔

بانسری کی تانیں ہواؤں کی طرح لہرائیں، بل کھائیں ہوا میں اُڑا کیں۔ ساتھ ساتھ بجنے والے ڈھولوں کی دھما دھم نے دلوں میں اُمنگ پیدا کر دی۔ رقص کرنے والی نوجوان لڑکیاں پھلجھڑیوں کی طرح مسکراتی ہوئی پھولوں کی خوشبو کی طرح اُٹھیں اور لہنگوں کو لہراتی ہوئی لٹوؤں کی طرح گھومنے لگیں۔ دہکتے ہوئے چہروں والی خادمائیں اپنے اُبھرے ہوئے کولھوں پر شراب کی مٹکیاں جمائے گھوم گھوم کر مہمانوں کے پیالوں میں آگ اُنڈیل رہی تھیں۔ اس شراب میں دودھ اور شہد کی خوشبو بھی شامل تھی۔ نوخیز لڑکوں کی ٹولیاں سرکے میں ڈوبی ہوئی مچھلیوں کی رکابیاں مُسکرا مُسکرا کر مہمانوں کے سامنے رکھ رہی تھیں۔

مہانتری ہاتھ میں شراب کا پیالہ لئے ہوئے اُٹھا اور اپنی پاٹ دار آواز میں بولا۔ خوشی کے اس موقعہ پر ہم اپنے پیارے فرعون کا جام صحت پیتے ہیں۔

ان گنت پیالے ہوا میں اُٹھے اور پھر لمحے بھر کے لیے مہمانوں کے ہونٹوں سے لگے اور خالی ہو گئے۔ اپنے پیالے کو ہوا میں اُچھال کر پرے پھینکتے ہوئے اونچی آواز میں اُس نے کہا۔ "ہمارا فرعون سانڈوں کا سانڈ ہے۔ وہ اپنے دشمنوں کو ایڑی تلے کچل کر ان کی چٹنی بنا دیتا ہے"

ہنسی کی گونج سے سارا ماحول تھر تھرا اُٹھا۔ فرعون کھُلے دل کا خوش مزاج آدمی تھا اس نے بُھلا دیا کہ وہ بادشاہوں کا بادشاہ فرعون ہے اور وہ سب کے ساتھ گھُل مل کر ہنسی مذاق کرنے لگا۔

اس کے صوبے داروں نے جو مختلف صوبوں سے آئے تھے فرعون سے شکایت کی کہ مصر کے لوگ دن بدن آرام طلب ہوتے جا رہے تھے اور اپنے گھروں میں گھُسے رہنے کے اتنے شوقین ہو گئے تھے کہ ان میں سے اکثر شاہی فوج میں داخل ہونے سے کتراتے تھے۔

اس پر فرعون کو بڑا تعجب ہوا

"ایسا کیوں؟ فرعون نے سب کو مخاطب کر کے کہنا شروع کیا۔ یہ بات تو بالکل میری سمجھ میں آئی ہی نہیں ـــــ ہمارے جوان مُردہ کیسے ہو گئے۔ کیا اب پاک زاد، خاندان کا ان پر کوئی حق نہیں رہا؟ ناسمجھ کہیں کے۔ کیا انھیں معلوم نہیں کہ باہری ملکوں میں پینے کو بہترین شراب ملتی ہے۔ اور لوٹ میں رس بھری چھاتیوں اور بھرپور رانوں والی نوجوان لڑکیاں اور سونے کے ڈلے انھیں گھرلانے کے لیے ملتے ہیں۔ ان کو اور کیا چاہیے؟...... اور سب سے بڑی بات یہ کہ کئی سال اتنے مسرت اور بہادری کی زندگی کو گذارنے کے بعد جب وہ اپنے گھروں کو لوٹتے ہیں تو وہ کمسن جنھیں وہ دھول میں کھیلتی چھوڑ گئے تھے ان کے لوٹنے کے وقت بڑھکر بھرپور جوانی حاصل کر لیتی ہیں۔ ان کی سپاٹ چھاتیاں یوں اُبھر آتی ہیں جیسے ویران ریگستان میں ریت کے ٹیلے۔ لڑائی سے واپس آنے والے سپاہی جن کی جیبیں سونے اور چاندی سے بھری ہوتی ہیں اُنھیں کوئی اور کام کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ شترمرغ کے پروں والے بستروں پر ان کی جوان بہنیں برسوں کی تکان دور کرنے میں ان کی مدد کرتی ہیں۔ اس طرح سے بڑے آرام اور سکون کے ساتھ وہ اپنا خاندان بڑھا سکتے ہیں"۔

سب لوگوں نے ایک آواز میں فرعون کے دماغ کی تیزی کی داد دی اور یہ ظاہر کیا کہ اس کا یہ سندیسہ ملک کے کونے کونے میں پہنچا دیا جائے۔

اب بے پر کی گپیں اُڑ رہی تھیں۔ بطخوں، مرغیوں، جنگلی بکروں کے گوشت کے علاوہ جانوروں کی پوری پوری ٹانگیں مہمانوں کے سامنے رکھی گئیں۔ مختلف قسم کے دوسرے مزے دار کھانوں کی تو کوئی حد ہی نہیں تھی۔ مہمان پیالے پر پیالہ شراب حلق میں اُنڈیل کر چٹخارے لیتے اور مزے دار کھانے کھا کر انگلیاں چاٹتے۔

دعوت زوروں پر تھی۔ بازی گر مہمانوں کو اپنے کرتب دکھا رہے تھے۔ بانسریوں کی تانیں اُڑ رہی تھیں اور نوجوان لڑکیوں کے کولھے تھرک رہے تھے۔ لیکن بڑا پجاری جیپیا بالکل چپ چاپ اپنی گھنی ابروؤں کی محرابوں کے تلے سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔

فرعون نے ایک لطیفہ سنانا شروع کیا۔ "کچھ ہی دن پہلے اسیریا کے راجہ کے سفیر ہمارے دربار میں حاضر ہوئے۔ ان کے ساتھ لمبے لمبے کانوں والے سات گدھے تھے۔ میں نے پوچھا ان پر کیا لدا ہے؟ ان میں سے ایک نے خوب جھک کر جواب دیا۔ اے عظیم بادشاہ! ان

گدھوں پر مٹّی کی بڑی بڑی اینٹیں لدی ہیں جن پر ہمارے بادشاہ کا آپ کے لیے پیغام کھُدا ہے۔ اس پر میں اپنی ہنسی روک نہ سکا۔

یہ لطیفہ سُناتے سُناتے فرعون پھر قہقہے لگانے لگا۔" ذرا اس بات کا اندازہ لگائیے کہ مجھے سندیسہ بھیجنے کے لیے 'اسیریا' کے بادشاہ کو سات گدھوں کی ضرورت پڑی۔" ساری مجلس فرعون کے ساتھ ہنس پڑی۔

مصر اس وقت دنیا میں سب سے مہذّب ملک مانا جاتا تھا کیونکہ خیالات اور رکھ رکھاؤ میں وہ سب سے آگے تھا۔ بڑے پجاری نے ایک بار پھر تنقیدی نظر سے مجلس میں بیٹھے خاص خاص شرفا کی سمت دیکھا اور دل ہی دل میں بولا۔" کیا یہ لوگ خیالات کی ترقی کے زینے پر چڑھنے کے لئے تیار ہیں۔

وہ قہقہوں کے تیز شور میں چُپ چاپ اپنی ہی اُلجھنوں میں پھنسا بیٹھا تھا۔

دھیرے دھیرے قہقہوں کا طوفان کم ہونے لگا۔ پہلے ہی سے ایسا انتظام کیا گیا تھا کہ زیادہ رات ہونے سے پہلے ہی دعوت ختم ہو جائے کیونکہ دوسرے دن صبح ستارۂ صبح کے نمودار ہونے سے پیشتر ہی سب کو 'طوم' کے بُت خانے میں پوجا کے لئے پہونچنا تھا۔ مشعلوں میں بتوں کو زندہ رکھنے کے لئے صرف تیل کی چند بوندیں ہی باقی رہ گئی تھیں۔ چراغ بُجھنے ہی پر تھے اور خوف سے اُس کی لویں تھرتھرا رہی تھیں۔ رقّاصاؤں کے قدم بوجھل ہو رہے تھے اور نغمہ سرائی کرنے والوں کے ہونٹ تھک چکے تھے۔ زمین پر ادھر ادھر شراب لنڈھی ہوئی تھی۔ ٹوٹی پھوٹی ہوئی ہنڈیاں پھیلی ہوئی تھیں اور مسلے ہوئے پھول زمین پر بکھرے ہوئے تھے۔

آدھی سے زیادہ رات بیت چکی تھی۔ جو لوگ شراب کے نشے میں دھت ہو گئے تھے انھیں خادموں نے اُٹھا کر ان کے بستروں پر پہونچایا۔ جب بڑا پجاری 'میشتی' کے پاس سے گذرا تو اُس نے تفریح گاہ کو سنسان اور خاموش پایا۔ لطف اُٹھانے والے واپس جا چکے تھے۔ اس لیے وہ جگہ اور بھی سنسان نظر آ رہی تھی۔ مختلف جگہوں سے آئے ہوئے فقیر اور زائرین پتھروں کے چبوتروں پر سو رہے تھے۔ کچھ نے سلوں کو جوڑ کر اس کی بیچ کو اپنا بستر بنا لیا تھا۔ دریائے نیل کی لہریں بڑی تیزی سے 'میشتی' کے چبوترے کو سانپ کی پھونک کی طرح بوسہ دیتیں اور پھر پیچھے لوٹ جاتیں۔ جب لہریں پیچھے لوٹتیں تو سلوں کے بیچ خالی جگہوں پر کچھ پانی چھوڑتی جاتیں۔ چاندنی میں یہ پانی چاند کی طرح چمکنے لگتا۔

جب بڑا پجاری مندر پہنچا تو سیڑھیوں کو سوتے ہوئے سادھوؤں اور زائرین سے بھرا پایا۔

بستر پر لیٹتے ہی بڑے پجاری کو نیند کی دیوی نے اپنی آغوش میں کھینچ لیا۔

مندر کے دوسرے حصّے میں سادھو جنتر منتر پڑھ رہے تھے۔ ان کی گنگناہٹ سارے ماحول میں گونج رہی تھی۔

یہ مندر ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہنے کے لیے بنایا گیا تھا۔ اسے سارے طوفان اور بھونچال بہادری سے جھیلنے تھے۔ گول تالاب کے دونوں طرف بنی عمارتیں آرٹ کے نقطۂ نظر سے لاثانی تھیں۔ رات کے پُرسکون ماحول میں جب کہ دریائے نیل کی لہریں مدھم پڑ گئی تھیں یہ مندر عجیب سا لگتا۔ عمارتوں میں اوپر نیچے سیڑھیاں بنی تھیں اور پشت کی طرف چوکور سے تالاب بنے تھے۔ ہر سادھو کو دونوں میں نہانے کی اجازت تھی۔ مندر کے اس حصہ میں دیوی 'رازانا' کا مجسّمہ نصیب تھا۔ یہ مجسّمہ سنگ مرمر کے پتھر سے بنا تھا۔ ہلکی روشنی میں دیوی کا یہ مجسمہ بادل کے ٹکڑے جیسا دکھائی دیتا تھا۔ مشعلیں جلائی گئیں۔ مجسّمہ کے دونوں طرف گہرے رنگوں میں رنگی عود و عنبر دانیاں رکھی گئیں جن میں عرب کا عود جل رہا تھا اور جس کا دھواں بل کھاتا ہوا چھت کی طرف بڑھ رہا تھا۔ دیوی کے سامنے ایک چبوترہ تھا جس پر بیلوں کی قربانی دی جاتی تھی جن کا گرم خون نیچے تالاب میں جمع ہوتا تھا اور گیدڑ کے مُنہ کی طرح بنی نلی میں سے بوند بوند کر کے گرتا تھا۔ تالاب کی دوسری طرف ایک اونچا چبوترہ تھا۔ یہاں پر مصر کی تیرہ سب سے حسین دوشیزائیں خون میں ڈبکی لگا کر رقص کرتی تھیں۔ اس کے دونوں طرف بنی ہوئی نلیاں انجیر کی نرم ٹہنیوں، جن میں نرم و نازک مُڑی ہوئی پتیاں لگی تھیں، کے سہارے لٹکی ہوئی تھیں۔

ابھی رات ایک پہر اور باقی تھی کہ زائرین جمع ہونا شروع ہو گئے۔ وہ اپنی مٹھیوں میں پھول لاتے جنھیں دیوی کے سامنے والے چبوترہ پر رکھ دیتے۔ جب چبوترہ بھر جاتا تھا تو پھول اُٹھا کر تالاب کے چاروں طرف بکھیر دئے جاتے۔

خادموں نے بڑے پجاری کو سوتے سے جگا دیا اور یہ خوش خبری سُنائی کہ سب پجاری، زائرین اور لوگ اپنی اپنی جگہوں پر پہونچ گئے ہیں۔ ان کے علاوہ شہر کے بڑے بڑے رئیس اور شاہی خاندان کے افراد بھی آچکے ہیں۔ وہ پاک سانڈ جو شہر کی ساری گلیوں میں گھمایا گیا تھا۔ اب واپس آچکا ہے۔

اس خاص موقع کے لئے بڑے پجاری نے خاص کپڑے پہنے اور "راوانا" کے مجسمہ کے پاس جا پہنچا جہاں خاص خاص پجاری پہلے ہی سے جمع تھے۔ ایک کونے میں ساز بجانے والوں کا جمگھٹ لگا ہوا تھا جو اپنے ہاتھ میں بربطیں۔ بانسریاں اور ڈھول وغیرہ تھامے کھڑے تھے۔ ان کے سامنے ہی وہ پاک سانڈ کھڑا تھا جسے ساری رات شہر کی گلیوں میں گھمایا گیا تھا۔ تالاب کے دوسری طرف تیرہ خوبصورت دوشیزائیں کھڑی تھیں جنھوں نے اپنے خوبصورت جسموں کو لمبے لمبے بالوں کی سیاہ گھٹاؤں کے پیچھے چھپا رکھا تھا۔

فرعون اپنے خاندان کے ساتھ دھیرے دھیرے سیڑھیوں پر چڑھ رہا تھا۔ مشہور رقاصہ مشیرا اپنے بھڑکیلے لباس میں اس خاص موقع پر اپنا لاثانی رقص پیش کرنے کے لئے تیار کھڑی تھی۔ وہ سب لوگ اب اس کا انتظار کر رہے تھے کہ فرعون اپنے تخت پر آ بیٹھے تو پروگرام شروع ہو۔ چونکہ زائرین کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ وہ دالان میں نہیں سما رہے تھے اس لیے بہت سے لوگ باہر ریت پر زانو موڑے بیٹھے تھے۔

بڑے پجاری نے بڑی غور و فکر سے آسمان کی طرف آنکھیں اٹھائیں اور تھوڑی دیر تک ٹمٹماتے ستاروں کو دیکھتا رہا۔ پھر وہاں سے نظریں ہٹا کر اس نے اپنے سامنے ٹھاٹھیں مارتے ہجوم پر ٹکا دیں۔ ایک بار پھر اس نے اپنے کو ٹٹولا ـــــ وہ کیسا سخت دھوکا ان لوگوں کو دینے جا رہا تھا۔

جیسے ہی فرعون اپنے تخت پر بیٹھا ویسے ہی نقارچیوں نے نقاروں پر چوٹ ماری اور ان کے نغموں سے ماحول گونج اٹھا۔ ساتھ ہی سازندوں نے اپنے ساز کے تاروں کو چھیڑ دیا۔ بانسریوں کی تانیں اڑیں اور ڈھولوں کی دھپا دھپ شروع ہو گئی۔

مشیرا ہاتھ سے دف بجاتی پاک تالاب کے دوسری طرف کے کنارے پر بنے چبوترے پر پہونچی اور بڑی تیزی سے چکّر لگاتی ہوئی رقص کرنے لگی۔ اس کی دراز زلفیں بھی اس کے ساتھ ساتھ اس کے گرد گھوم رہی تھیں۔

اس نے اچانک ہی ناچنا شروع کر دیا تھا اور اچانک ہی وہ رک گئی۔ چاروں طرف موت کا سنّاٹا چھا گیا۔ اس سنّاٹے میں مشیرا نے جو آندھی کی طرح آئی تھی چپ چاپ گھٹنے ٹیک دیے۔ ساتھ ہی سارا نغمہ بھی خاموشی کے سمندر میں ڈوب گیا۔ کچھ دیر تک وہ یوں ہی بیٹھی رہی۔ پھر وہ تیرہ کنواریاں دھیرے دھیرے تھرکتی ہوئی آئیں اور ان لوگوں نے اس کے

چاروں طرف گھیرا ڈال دیا۔ ایک بار پھر سنگیت کی دھیمی دھیمی تانیں ہواؤں کے دوش پر تیرنے لگیں اور مشیرا کے دف کی جھنکار پھر سے گونج اُٹھی۔

اب اس موقع کا خاص رقص شروع ہوا۔ یہ زندگی کے اختتام اور دیوتاؤں سے مغفرت کی دعائیں کرنے کو کہتا تھا۔ یہ رقص اور نغمہ دھیرے دھیرے شروع ہوا لیکن رقاصاؤں کے پاؤں کی رفتار لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جارہی تھی۔ آخر ایک بار پھر مشیرا اور دوسری رقاصائیں اتنی تیزی سے ناچنے لگیں جیسے سمندر میں طوفان آجائے۔ یا جیسے آتش فشاں پھٹ پڑے یا جیسے کالے بادلوں میں بجلی چمک کر آسمان کے ایک سرے سے نکل کر دوسرے سرے کو چلی جائے۔ نقارچیوں نے بھی مشیرا کا ساتھ دیا۔ ایک کے بعد دوسرا نقارہ پکارتا چلا گیا۔ اور ڈھول بجانے والوں نے روئی کی چھڑیوں سے ڈھولکوں کو پیٹ پیٹ ڈالا بربطوں کے تار تڑپ تڑپ اُٹھے۔ سننے والوں کے سر آواز اور تال کے ساتھ ہل رہے تھے۔ اِدھر آسمان میں ستارۂ صبح طلوع ہوا اُدھر مشیرا رقص کرتی ہوئی دیوی 'رازانا' کے سامنے پہنچی اور فرش پر پیشانی ٹیک کے لیٹ گئی۔ سارا ماحول ایک دم خاموش ہوگیا۔ لیکن ایک بہت بڑے ڈھول کی دھما دھم ماحول میں گونجتی رہی۔

اب بڑے پجاری جیپا کی باری تھی۔ اس نے اپنے لبادے کے پھڑپھڑاتے پلوؤں کو سنبھالتے ہوئے خاموشی سے دیکھتے ہوئے لوگوں کو مخاطب کیا اور پھر بھاری آواز میں کہنا شروع کیا۔

مصر کے لوگو! عورتو! بچو! لوہارو! کسانو! بڑھئیو! درزیو! مزدورو اور فلسفیو! آج کا دن بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ آج ہم اپنی دیوی 'رازانا' کی پوجا کرتے ہیں۔ جیسے آپ سب کو اس دن کا انتظار تھا ویسے ہی مجھ کو بھی تھا۔ میں آج کے دن آپ لوگوں کے سامنے ایک راز افشا کرنا چاہتا ہوں۔ پہلے میں بڑی کشمکش میں اُلجھا رہا کہ یہ راز آپ لوگوں کے سامنے افشا کروں یا نہ کروں لیکن آخر کار میں اسی فیصلے پر پہونچا کہ اس راز کو چھپا رکھنا غدّاری ہوگی۔

" خیر سب سے پہلے ایک کہانی سُنئے۔ یہاں سے بہت دور ایک اور ملک ہے۔ جس کا نام ہے یونان۔ وہاں کی دیومالا کی ہی کہانی میں آپ لوگوں کو سُنانے جارہا ہوں۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب آسمان سے دیوی اور دیوتا اُتر کر اکثر ہماری زمین پر آجایا کرتے تھے۔ انھیں دنوں 'تِتھانس' نام کا ایک جوان صبح کی دیوی 'اُرورا' پر عاشق ہوگیا۔ یہ دیوی دیوتا

اُپالو کے سورج والے رتھ کا پھاٹک کھولا کرتی تھی۔ وہ جوان ہر صبح اپنے مکان سے باہر نکل کر دیوی کی زیارت کرتا اور اپنے دھڑکتے دل کو سکون پہونچاتا تھا۔ دیوی کو بھی اس سے محبت تھی اور اسے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھنے کے لئے جنت میں لے گئی۔ وہاں وہ دیوتاؤں اور انسانوں کے بادشاہ 'جوپیٹر' کے سامنے پہونچی اور سر جھکا کر درخواست کی کہ وہ اس کے عاشق کو امر بنادے۔ اس کی درخواست قبول ہوئی۔ اب وہ دونوں ہر تکلیف سے آزاد ہو کر مزے سے زندگی گذارنے لگے۔

کچھ برسوں بعد ٹتھانس کی جوانی ختم ہونے لگی اور بڑھاپا چھانے لگا۔ دیوی پھر بھی اس کو پیار کرتی رہی۔ آخر اس کے سارے دانت جھڑ گئے۔ اس کی نظر بہت کمزور ہو گئی۔ اس کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ ایک روز اس نے اپنی کپکپاتی کمزور آواز میں کہا کہ وہ کب تک اسے پیار کرتی رہے گی۔ اب اس میں کسی قسم کی طاقت موجود نہیں تھی۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ آپ وہ موت کی گود میں ہمیشہ کے لئے سو سکتا۔ اس صورتحال سے بچنے کی اور کوئی راہ نہ پاکر وہ جیوپیٹر کے سامنے پہونچی۔ اور ایک بار پھر درخواست کی کہ وہ اس کے عاشق کو موت دے دے۔ جیوپیٹر نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ نہیں بیٹی، اس بات پر زور مت دو۔ کیونکہ خود دیوتا بھی اپنے بخشے ہوئے وردانوں کو واپس نہیں لے سکتے۔"

بڑا پجاری کچھ دیر کے لئے رُکا۔ سب لوگ بڑے غور سے سُن رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ وہ سارے مصر میں سب سے زیادہ عقلمند اور عظیم کردار کا انسان تھا۔ بڑے پجاری کی آواز پھر بلند ہوئی۔

مصریو! تمھاری تہذیب دنیا کی ساری تہذیبوں پر بھاری ہے ـــــ میں آپ لوگوں سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ میرے الفاظ کو غور سے سُنیں۔ میں آپ کو اپنی ماؤں کی قسم کھلاتا ہوں جنھوں نے نو مہینے تک آپ کو اپنے پیٹ میں رکھا اور جب آپ پڑھنے جاتے تھے تب وہی مائیں آپ کے لئے زیتون کا تیل، کھجوریں اور روٹیاں لے جاتی تھیں۔ ہاں انہیں ماؤں کی قسم کھلا کر کہتا ہوں کہ میری بات پر ٹھنڈے دل سے غور کریں! ابھی جو کہانی میں نے آپ کو سُنائی اُس کا صرف ایک ہی مطلب ہے وہ یہ کہ فطرت کے کچھ اپنے اصول ہیں اور وہ اصول اٹل ہیں۔ یہ وہی اصول ہیں جن پر ساری تبدیلیوں کا انحصار ہے۔ اسی بنیاد پر میں کہتا ہوں کہ یہ سمجھنا بے وقوفی ہے کہ 'رازانا' کی پوجا کرنے کی وجہ سے دریائے نیل میں باڑھ آتی ہے۔ یہ سمجھنا

ہماری ناسمجھی ہے کہ کھیت اس لئے سینچے جاتے ہیں، سورج سے اناج اس لئے پکتا ہے اور پیڑوں
میں کونپلیں اس لئے پھوٹتی ہیں کہ ہم........"

وہاں بیٹھے لوگوں میں بے چینی کی ایک لہر سی دوڑ گئی اور بڑبڑانے کی آواز سنائی
دینے لگی۔ بڑے پجاری نے اپنی آواز اور بھی اونچی کر کے کہا۔

ہاں میں یہی کہتا ہوں کہ ہماری کم عقلی ہے! معصوم جانوروں کی بلی اور دوسری
باتیں سب ڈھکوسلے ہیں۔ مصریو! میری بات کا یقین مانو کہ ان سب کے بغیر بھی دریائے
نیل میں باڑھ آئے گی .... موسم بدلتے رہیں گے .... سوکھے پیڑ د
میں کونپلیں پھوٹیں گی۔ میں آپ لوگوں سے کہتا ہوں کہ آپ کو ماتھے رگڑنے کی کوئی
ضرورت نہیں ہے۔

فرعون اپنے تخت پر سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ ساری مجلس میں گڑبڑ مچ گ
لوگ چیخنے چلانے اور ادھر ادھر بھاگنے دوڑنے لگے۔ فرعون کا پالتو شیر بھڑک کر بھاگا تو
ڈر گئے۔ اور کچھ تو لوگوں کے پاؤں تلے کچل گئے، بیل سینگ ہلاتے ہوئے بھیڑ میں گھس گ
بہت سے لوگوں نے بڑے پجاری کو گھیرے میں لے لیا۔ وہ چلانے لگے کہ پجاری پاگل ہو گ
ہے۔ اسے ہوش سے کام لینا چاہیئے۔ انھوں نے اس کی خوشامد بھی کی۔ اسے مار ڈال
کی دھمکیاں بھی دیں۔ لیکن وہ اپنی بات پر ڈٹا رہا۔ وہ باہیں اٹھا کر الٹے انھیں کو سمجھا
لگا کہ وہ غلط راستے پر چل رہے ہیں۔ اور وہ انھیں صحیح راہ بتا رہا ہے۔ اس نے بار با
کہ فطرت کے اصول میں کسی دیوی دیوتا کا ہاتھ نہیں ہے۔ اور نہ مصریوں کو دیوی دیو
کی ضرورت ہے۔ آخر میں اس نے یہ بھی کہا کہ وہ انھیں خواب سے جگانا چاہتا ہے۔ ا
ان کی غلط فہمیاں دور کرنا چاہتا ہے.......... مصر میں یہ خبر یوں پھیلی جیسے جنگل میں آ
مصر میں یہ بات انوکھی تھی۔ پہلے کسی نے ایسا نہیں کہا تھا۔ سب لوگ حیران تھے کہ بڑ
پجاری کی عقل گھاس چرنے چلی گئی ہے؟ وہ 'رازانا' دیوی کے قہر کو جھنجھوڑ جھنجھ
جگا رہا تھا۔

انھیں سب سے بڑی پریشانی آنے والے قحط کی تھی۔ موسم 'رازانا' کی اجازت
کیسے بدلے گا؟ دریائے نیل کا پانی سوکھ جائے گا۔ کھیتیاں سوکھ جائیں گی۔ پیڑ، گھاس
ہریالی چلی جائے گی۔ مصر پر دیوتا کا قہر آئے گا۔ انسان قحط کے جال میں جکڑ جائے گا

گر ڈھور کیچڑ کھائیں گے۔ بھوکے لوگ کتے اور بلی کو مار کر کھائیں گے اور پھر شاید بچوں کے کھانے باری آئے۔ دیوتا طوم کی یہ چُنی ہوئی ذات ختم ہو جائے گی۔

لیکن بڑا پجاری پھر بھی اپنے فیصلے پر اٹل رہا۔ جب تک بڑا پجاری حصّہ نہ لے تب تک پوجا پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کی جگہ بڑا پجاری بھی نہیں چن سکتے تھے کیونکہ چناؤ بڑا پجاری ہی کرے تو صحیح مانا جاتا تھا۔ بڑے پجاری کو جان سے مار ڈالنا بھی سخت گناہ تھا۔ اس لئے جیبپا کو فرعون کے حکم سے شاہی محل کے کالے تہ خانے میں پھینک دیا گیا۔

ہر گھر میں رونا دھونا شروع ہو گیا۔ ہر قسم کی تفریح اور کھیل تماشا بند کر دیا گیا۔ اب دریائے نیل کا کنارا سنسان دکھائی دینے لگا۔ چاند سے چہرے والی عورتوں نے اپنے بالوں میں خاک ڈال لی۔ ریٹوں کی اڑتالیس اڑتالیس چپوؤں والی کشتیاں کیچڑ میں پڑی پڑی سڑنے لگیں۔ نغمہ نوازوں نے اپنے ساز توڑ ڈالے۔ عورتیں شہر کی گلیوں میں بین کرتی پھرنے لگیں۔

اس طرح وہ ہنستا بولتا چہکتا شہر یوں لگنے لگا جیسے اس میں انسان نہیں بھوت بستے ہیں۔ یا اسے چلتے پھرتے مُردوں کا شہر کہہ سکتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے جاندار سے لے کر فرعون تک سب سہمے ہوئے تھے۔ وہ یہ تو جانتے ہی تھے کہ اب کی دریائے نیل میں باڑھ نہیں آئے گی جس سے سارے ملک میں قحط پڑ جائے گا اور نہ جانے کتنی آبادی ختم ہو جائے گی۔ بلکہ اسکے علاوہ نہ جانے دیوی "رازانا" کی کیا بددُعا اس ملک پر پڑے۔

ایک دن کچھ چرواہوں کے بچے گدھوں پر سوار انھیں تیزی سے دوڑاتے ہوئے شہر میں داخل ہوئے اور یہ خبر پھیلا دی کہ انھیں دریائے نیل پر کچھ مٹیالی لکیریں دکھائی پڑی ہیں۔ کسی نے ان کی باتوں کا یقین نہیں کیا کیونکہ ان مٹیالی لکیروں کا مطلب یہ تھا کہ دھیرے دھیرے دریا میں سیلاب آنے والا تھا۔ پھر بھی کچھ لوگ اونٹوں پر سوار ہو کر ندی کے کنارے تک گئے اور واپس آکر بتایا کہ لڑکے جھوٹ نہیں بول رہے تھے۔ کچھ دنوں میں یہ بات طے ہو گئی کہ دریا کی سطح اونچی اُٹھ رہی تھی ....

اور پھر سچ مچ ہی بڑے زور شور سے باڑھ آ گئی۔

چونکہ سیلاب کے دنوں میں دریا کا پانی اپنے کناروں کو پار کر کے بہت دور دور تک

نشیب میں پھیل جاتا تھا۔ اس لئے دریا کے کنارے پر بسے دیہاتوں کے لوگ اپنی کچی این
کے بنے مکانوں کو گرا دیتے اور گھر کے باقی سامان کے ساتھ اینٹوں کو بھی گدھوں
لاد کر سیلاب زدہ علاقے سے پرے نکل جاتے۔ جب سیلاب کم ہو جاتا اور پانی وہاں
ہٹ جاتا تو اپنے پیچھے زمین پر بہت اچھی مٹی کی تہہ چھوڑ جاتا۔ لوگ واپس آ کر پھر
اپنے مکانوں کو بناتے اور زمین پر ہل چلا کر بیج بو دیتے۔ اب کی بھی وہی بات ہو
باڑھ آنے پر خوشی کی ایک لہر ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک دوڑ گئی۔ اپ
گھریلو چیزوں، عورتوں اور بچوں سے لدے گدھوں کے کارواں ہر طرف دکھائی د
رہے تھے۔

اس طرح سے دریا کا پانی ایک بار پھر طوم کے مندر کی ایک سو پانچویں سیڑھی تک
پہنچ کر رک گیا۔ دیہاتوں کے لوگ واپس آئے۔ ایک بار پھر جوانوں نے سرکنڈوں
کاٹ کر بانسریاں بنائیں اور پیار کے گیت گانے لگے۔ 'میشتی' کا ماحول پھر قہقہوں
گونج اٹھا اور اس کے پتھریلے فرش پر شراب کی ننھی ننھی ندیاں بہہ نکلیں۔ نازک اور
جسم والی نوجوان لڑکیاں امنگوں اور ترنگوں سے بھرے رقص کرنے لگیں۔ ہر طرف
کے تاروں کی جھنکار اور ڈھولوں کی تھرتھراہٹ سنائی دینے لگی۔

ایک دن فرعون کے کچھ چنے ہوئے لوگ راج محل کے تہہ خانوں میں گئے۔
بڑا پجاری گیلے فرش پر پڑا تھا۔ وہ بہت کمزور ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے نی
حلقے پڑ گئے تھے اور بچھوؤں نے ڈنک مار مار کر اس کی ایڑیوں کو سجا دیا تھا۔

سب لوگوں نے زمین پر لیٹ کر بڑے پجاری کے پاؤں کو چوما اور اسے بت
'طوم' اور 'رازانا' کے بت توڑ ڈالے گئے ہیں۔

بڑا پجاری یہ سن کر مسکرایا۔ سچ مچ وہ بہت خوش تھا۔ اس نے کھلے دروا
سے روشنی کو تہہ خانے میں آتے دیکھا اور دھیرے سے بولا: "یہ سچائی کی جیت ہے۔ یہ اند
پر روشنی کی فتح ہے۔"

جب وہ لڑکھڑاتے پیروں سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر پہنچا تب اس
ایک لمبے عرصے کے بعد نیلے رنگ کا صاف شفاف آسمان دیکھا۔ ابابیلیں ہوا میں لہرا
تھیں ــــ

کچھ دیر تک اُس کی اندھیرے کی عادی آنکھیں دن کی تیز روشنی کو برداشت
نہیں کر سکیں۔ لاکھوں زائرین بے چینی سے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ جیوں ہی انھوں نے
بڑے پجاری کو دیکھا سر جھکا دئے اور ماحول اُس کی جے جےکار کے نعروں سے گونج اُٹھا۔
مکانوں کی چھتوں پر، کھڑکیوں پر، سڑکوں پر، جہاں بھی نظر جاتی تھی۔ بچّے، بوڑھے،
جوان عورتیں اُسے دیکھنے کے لئے جمع ہو رہے تھے۔ مصری عورتوں نے بڑے پجاری کے
راستے میں اپنے لمبے لمبے سیاہ ریشمی بال بچھا دئے تاکہ اس کے پاک قدموں کو دھول نہ
لگنے پائے۔

کئی قسم کے سازوں کے دلکش نغمے ماحول کو اور نشہ آور بنا رہے تھے۔ فرعون خود
آگے بڑھا اور بڑے پجاری کی طرف بڑھا اور پاس پہنچ کر سر جھکا دیا۔ اُسی وقت شاہی نقارا
بجا تاکہ لوگ خاموش ہو جائیں اور فرعون کی بات کو غور سے سُنیں۔ جب ہر طرف خاموشی
چھا گئی تو فرعون نے بھاری آواز میں کہنا شروع کیا :۔

"مصریو! اب ہم نے 'طوم' اور 'رازانا' کے مجسمے توڑ ڈالے ہیں۔ ان کے علاوہ
اور بھی چھوٹے دیوتاؤں کے مجسمے ختم کر دئے ہیں"۔ اور پھر بڑے پجاری کی طرف گھوم کر
اس نے نرم لہجہ میں سر جھکا کر کہا۔ "ہمیں اس بات پر سخت ندامت ہے کہ آپ کو ہم نے اتنے
دکھ دئے۔ افسوس کہ ہم آپ کو پہلے نہیں پہچان پائے۔"

یکایک بڑے پجاری کے ہونٹوں کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ جب اس نے دیکھا
کہ بت تراشوں کا جھنڈ اس کے سامنے آکر سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ بڑا پجاری فوراً اصلی
بات سمجھ گیا۔ چنانچہ اپنی آنکھوں پر بازو رکھ کر وہ جلدی سے دو قدم پیچھے ہٹا اور سر
ہلاتے ہوئے چلّایا۔ "نہیں، نہیں ہرگز نہیں۔" پھر وہ بیہوش ہو کر سیڑھیوں پر گر پڑا۔

لوگوں نے سوچا کہ شاید وہ کمزور ہونے کی وجہ سے بیہوش ہو گیا ہے۔ وہ اسے
پالکی میں ڈال کر مندر میں لے گئے۔ دو دن تک اس نے آنکھیں نہیں کھولیں اور پھر
جب اُسے ہوش آیا تب اس نے سب حکیموں اور خادموں کو کمرے سے باہر نکلوا دیا۔ صرف
اس پگلے فقیر کو اپنے پاس بیٹھنے کی اجازت دی۔

یہ خبر سنتے ہی بڑے پجاری کو ہوش آگیا ہے۔ ہزاروں آدمی مندروں کی طرف
چل دئے لیکن وہاں پہونچنے پر انھیں معلوم ہوا کہ تھوڑی دیر ہوش میں رہنے کے بعد اس کی

روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

جب فرعون کو یہ خبر ملی تو وہ فوراً شاہی پالکی میں بیٹھ کر مندر کی طرف چل پڑا۔ اس وقت تک لاکھوں آدمی وہاں جمع ہو چکے تھے۔ جب انھوں نے شاہی پالکی کو آتے دیکھا تو کنارے ہو کر بیچ میں راستہ چھوڑ دیا۔ ان سب کے دُکھ کا اندازہ مشکل نہ تھا ان کی آنکھیں آنسو بہا رہی تھیں۔

فرعون بھاری قدموں سے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اس وقت وہ بگلا سنیاسی بڑے پجاری کے کمرے سے بھاگتا ہوا باہر نکلا اور اپنے دونوں ہاتھ ہوا میں اُٹھا کر چلّایا۔

لوگو سنو! ــــ فرعون کے پاؤں رُک گئے۔ سب لوگ سنیاسی کی طرف دیکھنے لگے۔ اس نے اپنے پھیپھڑوں کی پوری طاقت لگا کر چیختے ہوئے کہا:۔

مصریو! بڑے پجاری نے مرتے وقت کہا تھا وہ دیوتا نہیں ہے۔ اس کی خواہش تھی کہ اس کا مجسمہ نہ بنایا جائے اور نہ اس کی پوجا کی جائے۔ اس نے مجھے یقین دلایا کہ وہ آپ سب لوگوں کی طرح ایک معمولی انسان تھا۔

سادھو کی بات سُن کر فرعون کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ سادھو کے پاس کھڑے مجیروں نے اپنے بادشاہ کا اشارہ پاکر اسے اُٹھالیا اور گھما کر کچھ اس طرح پھینکا کہ وہ فرعون کے پاؤں میں جا گرا۔ فرعون نے اپنا شاہی عصا ہوا میں اُٹھایا اور بھرپور وار سے اس کا سر کچل دیا۔ اس کے بعد فرعون ایک پل رُکے بغیر اسی رعب کے ساتھ سیڑھیوں پر چڑھنے لگا۔ اس طرح وہ بڑھتا ہوا بڑے پجاری کے قریب پہنچ گیا۔ سب لوگ سر جھکائے خاموش اس کے نیچے کھڑے رہے۔

ڈوبتے سورج کی کرنیں بڑے پجاری کے مُردہ چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ اس کا سارا جسم سفید چادر سے ڈھکا ہوا تھا صرف چہرہ کھلا ہوا تھا۔ اس وقت بھی اس کے ادھ کھلے منہ سے حیرت ٹپک رہی تھی۔ اس کی بھرّائی آنکھیں یوں دکھائی دیتی تھیں جیسے کوئی بہت ہی بھیانک خواب دیکھ رہا ہو۔

قریب پہونچ کر فرعون نے اپنا شاہی عصا بڑے پجاری کے قدموں کے پاس رکھ دیا اور خود گھٹنے کے بل جھک کر پیشانی زمین پر ٹیک دی۔

جو لوگ پاس کھڑے تھے انھوں نے بھی گھٹنے ٹیک دئے اور ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی میلوں تک پھیلے ہوئے لوگوں کی پیشانیاں زمین پر جا ٹکیں۔

(ہندی کہانی)

ظہیر سراج

مچھلی میری نہایت پسندیدہ ڈش تھی، جسے میں بڑے شوق سے پکوا کر کھایا کرتا تھا۔ لیکن اب سے تقریباً ۴۵ سال کا عرصہ ہوا جب سے میں نے مچھلی کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔

آپ کو انتظار ہوگا کہ میں آپ کے سامنے وہ رُوداد پیش کروں جس کی بنا پر میں نے مچھلی کھانا ترک کر دیا۔

رُوداد کا لفظ میں نے قصداً استعمال کیا ہے کیونکہ بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ میں صرف مچھلی نہ کھانے کی وجہ بیان کر کے ختم کر دوں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مجھے اس سلسلہ میں آپ کو پوری ایک کہانی سنانی ہے۔

غالباً سنہ ۱۹۳۲ء کا ذکر ہے۔ دسمبر یا جنوری کا مہینہ تھا۔ گھر میں حیدرآباد سے دادی اماں کے آجانے کی وجہ سے ایک خاص قسم کی رونق اور چہل پہل بڑھ گئی تھی جو عام طور پر ایسے بڑے بوڑھوں کی موجودگی سے پیدا ہو جایا کرتی ہے۔

ایک دن بیگم نے میری پسند کا خیال کر کے اپنے ہاتھ سے مچھلی پکائی۔ دادی اماں ہمارے ساتھ کھانے میں شریک تھیں۔ بیگم نے گرم گرم مچھلیاں تل کر بھیجیں اور میں نے اپنے ہاتھ سے مچھلی کے دو قتلے دادی اماں کی پلیٹ میں رکھ دئے اور کہا:

"لیجیے اس کو بھی ذرا چکھیے مجھے مچھلی بہت پسند ہے۔ بیگم نے اس کو اپنے ہاتھ سے پکایا ہے۔"

مجھے تو یہ انتظار تھا کہ دادی اماں میری پیش کش پر اپنی رغبت و پسندیدگی کا اظہار کریں گی مگر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھیں ساون بھادوں کے بادلوں کی طرح آنسوؤں کی جھڑی لگائے ہوئے تھیں۔ روتے روتے دادی اماں کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

ہم لوگ حیران کہ خدایا یہ کیا ہو گیا۔ ہر ایک ان سے پوچھنے لگا کہ آخر کیا بات ہوئی، کچھ بتائیے تو سہی مگر وہ صرف یہی کہتیں کہ میرے سامنے سے مچھلی ہٹاؤ۔

مچھلی کھانے پر سے فوراً ہٹا دی گئی۔

ہمارے مسلسل اصرار کے بعد دادی اماں نے کہنا شروع کیا :۔

ہم لوگ پانچ بھائی بہن تھے۔ تین بھائی اور دو بہنیں، ہمارے سب سے بڑے بھائی سید اکرام حسین تھے۔

ہمارے ماں باپ کا انتقال ہم لوگوں کے بچپن ہی میں ہو گیا تھا اور ہم لوگ رشتہ کے ایک پھوپھا کے پاس رہتے تھے لیکن حالات نے ہم کو مجبور کر دیا اور ہم ان کا گھر چھوڑ کر اپنے آبائی مکان میں اٹھ آئے۔ اس وقت میری عمر آٹھ دس سال کی اور بھائی صاحب کی عمر پندرہ سولہ برس کی رہی ہو گی۔

ہمارے خاندان کا ایک پرانا اسامی تھا "نرائن" وہ اپنے زمیندار کے یتیموں کو اس تکلیف کی حالت میں نہ دیکھ سکا۔ جیسے ہی اس نے ہم لوگوں کو اپنے پرانے آبائی گھر میں جاتے دیکھا سیدھا اپنے گھر پہنچا اور جلدی جلدی کچھ چیزیں ایک گٹھری میں باندھ کر بھیا کے پاس لے آیا۔ سلام کر کے گٹھری اپنے سر سے اتاری اور زمیندار کے پیروں میں ڈال دی۔

بھیا نے پوچھا "یہ کیا ہے نرائن"؟

"کچھ نہیں بھیا" کھیت کا نوا (نیا) دھان رہا۔ ہم کہا جمیدار کے پاس لے چلی تھوڑا سا گڑ رہا تون لے آوا۔ سرکار آپ لوگ امیر منئی ہیں۔ ہم گریبن کی پیچھو کبول کر لیں —— اور بھیا آپ لوگ اب اپنے باپ دادا کے گھر میں رہا کریں۔ مکان میں کچھ مرمت کی جرورت ہوئی تو ہم کا بتائے دیں۔ ہم ٹھیک ٹھاک کے دیئی.........

اور سرکار ای چالیس روپیہ رہا ہم لی آوا آپ یہو رکھ لیں کام آئی......"

نرائن کی ہمدردی اس آڑے وقت میں غیبی مدد سے کم نہ تھی۔ وہ محبت اور ہمدردی جو

انہوں یگانوں سے ظاہر ہونی چاہئے تھی آج ایک غیر اور بیگانے سے ظاہر ہو رہی تھی ۔ بھیا نے کہا۔
" نارائن! ہم تمھارا مطلب سب سمجھ گئے۔ تمھاری یہ سب چیزیں بھی ہم نے لے لیں تم نے اس وقت بڑا کام کیا۔ ہم کو تمھارے ہی جیسے آدمی کی ضرورت بھی تھی!"
نرائن چلا گیا تو بھیا وہ سب چیزیں گھر میں لائے اور میرے سپرد کر کے پھر باہر چلے گئے۔

(۲)

نئے مکان میں رہتے ہوئے چند سال گذرے تھے کہ بھیا کو ملازمت کے لئے وطن نگرسن کو چھوڑ کر باہر نکلنا پڑا اور وہ الہ آباد کے دفتروں کا چکّر لگانے کے بعد کسی طرح باندہ پہنچ گئے وہاں کلکٹری میں ان کو ملازمت مل گئی۔ کچھ دنوں تک نائب ناظر کی حیثیت سے کام کیا پھر کلکٹر نے (جس کا نام سانڈرس اسٹیل تھا) ان کو اپنی پیشکاری میں لے لیا اب وہ کلکٹر کے پیشکار ہو گئے اور ہم لوگ ان کے ساتھ باندہ میں رہنے لگے۔
چند سال کے بعد اسٹیل صاحب کمشنر ہو کر سیتا پور چلے گئے تو وہاں جا کر انھوں نے بھیا کو بھی اپنے دفتر میں بلا لیا۔ اب ہم لوگ سیتا پور چلے گئے۔
۱۸۵۷ء ہندوستان کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اسی سال ہندوستان میں انگریزوں اور ہندوستانیوں کے درمیان وہ ہنگامہ ہوا جس کو انگریزوں نے غدر کے نام سے مشہور کر دیا۔ حالانکہ وہ آزادی کی پہلی کوشش تھی جو ہندوستانیوں کی طرف سے ظاہر ہوئی تھی۔ اسی ہنگامہ میں ہوا یہ کہ سیتا پور کے کمشنر نے بھی اپنے آپ کو اور اپنے بال بچّوں کو خطرہ میں محسوس کیا اور بھیا کو بلا کر ہچکچاتے ہوئے ان سے کہا:۔
سید صاحب! اس بلوہ میں اگر آپ بھی دوسرے ہندوستانیوں کے ساتھ شریک ہو جائیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں مگر میں آپ کو عقلمند، دور اندیش اور رحم دل سمجھ کر کہتا ہوں کہ " وقتی جذبات سے مغلوب نہ ہو جائیں۔ کل معلوم نہیں کیا ہو؟"
" آپ اگر اس وقت کسی طرح میم صاحب اور مس بابا کو بچا لیں تو بڑا احسان ہو۔ شریف دشمن سے بھی مہربانی کی اُمید کی جاتی ہے اور آپ تو خیر دوست ہی ہیں!"
بھیّا نے کہا کمشنر صاحب!
" میں مدد کو حاضر ہوں لیکن ان لوگوں کو اگر میں اپنے گھر میں پناہ دیتا ہوں تو نہ صرف ان کی جان بلکہ میری اور میرے سارے گھر والوں کی جان خطرہ میں پڑ جائے گی "

کمشنر صاحب! کسی طرح یہ لوگ کانپور...... انگریز تک حفاظت کے ساتھ پہنچ سکتے ہیں"،

"بھیا! ہاں یہ کام میں کر سکتا ہوں"۔

"تو کب تک ان کو کانپور پہنچا دیجیے گا"، کمشنر صاحب نے بڑی بے تابی سے پوچھا۔

"کل صبح ہوتے ہوتے خدا نے چاہا تو یہ لوگ بحفاظت کان پور پہنچ جائیں گے"۔ بھیا نے بہت اطمینان سے جواب دیا اور کہا کہ :۔

میرے خیال میں تو آپ بھی اسی بہل میں سوار ہو کر چلے جائیے۔ اس پر پردہ پڑا رہے گا اور میرا خاص نوکر کرم علی بھی گاڑی بان کے ساتھ بیٹھا ہو گا لوگ سمجھیں گے کہ زنانی سواریاں ہیں۔

سید صاحب آپ کا بہت بہت شکریہ۔ میں خود تو بہل پر نہ جاؤں گا۔ عورتیں چلی جائیں۔ میں ایک دن بعد گھوڑے پر جاؤں گا"۔ مسٹر اسٹیل نے کہا۔

"مگر اس میں آپ کی جان کا خطرہ ہے"۔ بھیا نے اندیشہ ظاہر کیا۔

"کچھ بھی ہو عورت بننا مجھے گوارا نہیں"، مسٹر اسٹیل نے جواب دیا۔

شام کا جھٹپٹا ہو چلا تھا۔ اکرام حسین بھیا دروازہ پر کھڑے تھے۔ کرم علی اُن سے سفر کا حال بیان کر رہا تھا۔ یکایک شور کی آوازیں کانوں میں آنے لگیں اور دیکھتے دیکھتے ایک بڑے مجمع نے ہمارے مکان کو گھیر لیا۔ بھیا نے ہمت کر کے پوچھا:۔

"کیوں بھئی کیا بات ہے؟"

"اسٹیل کمشنر اور اس کے بیوی بچوں کو ہمارے حوالے کر دو" (مجمع سے آوازیں بلند ہوئیں)

"کمشنر صاحب اپنے بنگلے پر ہوں گے میرے یہاں نہیں ہیں"۔ (بھیا نے کہا)

"بنگلہ خالی ہے۔ تم نے ان کو چھپا رکھا ہے"۔ (مجمع ایک آواز ہو کر بولا)

"نہیں میں نے نہیں چھپایا"

"تو تم کو معلوم ہے وہ کہاں ہیں؟"

"نہیں، میں یہ بھی نہیں جانتا"

"یہ اس فرنگی بچے کے دوست ہیں یہ نہ بتائیں گے"۔ (مجمع سے آوازیں بلند ہوئیں)

کرم علی پہلے ہی سے مجمع کے تیور بھانپ گیا تھا۔ اکرام حسین تو مجمع سے گفتگو میں لگے ہوئے تھے۔ اس نے اندر جا کر بندوق سنبھال لی کہ اگر رنگ بگڑتا دیکھے تو دس پانچ کو قتل کر کے مالک پر نثار ہو جائے۔ اپنے محسن کا نمک اس کے نزدیک جان سے زیادہ میٹھا تھا۔

بھیا نے بھی موقع کی نزاکت محسوس کرلی تھی۔ مگر کڑک کر بولے۔

"دوستو! اگر مجھے ختم ہی کرنا چاہتے ہو تو شوق سے ختم کردو۔ مکان کی تلاشی لینا چاہتے ہو تو بسم اللہ مکان حاضر ہے۔ لیکن ملک و قوم کی غداری کا شبہہ مجھ پر ہرگز نہ کرو۔"

بھیا کے اطمینان بھرے جواب سے وہ مجمع ذرا ٹھنڈا ہوا اور ان میں سے کوئی بولا۔

"معلوم ہوتا ہے وہ اسٹیل انگریز کا بچہ کہیں بھاگ نکلا ہے چلو واپس چلیں"۔

سارے مجمع نے اپنی خاموشی سے اس کی تائید کی اور ہمارے مکان کا گھیرا ختم کر کے رخصت ہو گیا۔

شاید مئی سے اگست تک انگریزوں کے سر پر خونین بادل چھائے رہے مگر ستمبر کے ختم ہوتے ہوتے اس نے پھر قبضہ جانا شروع کردیا اور آہستہ آہستہ اپنی گئی ہوئی حکومت واپس لے لی۔ جب سارے ملک پر اقتدار ہوگیا تو منادی کردی گئی کہ "گورنمنٹ کے وہ ملازمین جو بلوائیوں کے خوف سے روپوش ہوں اپنی اپنی ملازمتوں پر واپس آجائیں"۔

بھیا محمود آباد میں اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ ٹھہرے ہوئے امن قائم ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ یہ سن کر وہاں سے چلے اور کمشنر صاحب کی تلاش میں کانپور پہنچے وہاں ان کو پتہ چلا کہ مسٹر اسٹیل تو بلوائیوں کے ہاتھوں قتل ہو گئے مگر ان کے بڑے داماد جو کلکٹر باندہ ہیں اپنے عملہ کے ساتھ یہیں ہیں۔ یہ خبر سن کر بھیا کو امید کی ایک جھلک معلوم ہوئی۔ ایک خط کلکٹر صاحب باندہ کے نام لکھا کہ "میں سیتاپور میں مسٹر اسٹیل کا سررشتہ دار تھا وہ مجھ پر بہت مہربان رہے ہیں۔ ہم کو یہ سن کر خوشی ہوئی کہ آپ یہیں ہیں ہم آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ براہ کرم کوئی وقت مقرر کردیجئے تو ہم حاضر ہوں"۔

یہ خط لکھ کر کرم علی کو دیا کہ کلکٹر باندہ کا پتہ پوچھ کر ان سے ملو اور اس کا جواب لے آؤ۔ اب اس کو اتفاق سمجھو یا کچھ اور کہ ان دنوں کلکٹر باندہ کا پیشکار وہی شخص تھا جو سیتاپور میں بھیا سے ایک معاملہ میں بڑی زک اٹھا چکا تھا۔

بھیا کا خط لے کر جب کرم علی کلکٹر باندہ کے پاس پہنچا تو وہ پیشکار بھی کمرہ میں موجود تھا کلکٹر باندہ اکرام حسین بھیا کے نام سے خوب واقف تھا۔ اپنی ساس اور بیوی سے ان کی ہمدردی و انسانیت و احسان کا قصہ سن چکا تھا بھیا کا خط پڑھ کر بہت خوش ہوا اور پیشکار سے کہا۔ سید اکرام حسین سررشتہ دار کمشنری کا یہ خط ہے وہ یہاں سرائے میں ٹھہرے ہیں میں ان سے ملنے شام کو جاؤں گا بڑے اچھے آدمی ہیں"۔

اکرام حسین کا نام سن کر پیشکار کے بدن میں آگ لگ گئی۔ اس کو وہ زک یاد آگئی جو اس نے سیتا پور میں ان کی بدولت اٹھائی تھی۔ اس موقع پر کیسے چوکتا وہ خاموش نہ رہ سکا آخر اُس نے کہا:۔

"حضور! وہ تو اوّل درجہ کا باغی ہے راجہ محمود (باغیوں کے سرپرست) کا خاص دوست ہے۔ یہ بلوائیوں سے ملا ہوا تھا۔ حضور! مسٹر اسٹیل کو اسی کے آدمیوں نے تو قتل کیا تھا۔ اب آج حضور اسی سے ملنے جائیں گے۔"

پیشکار کا نشانہ ٹھیک بیٹھا ——— کلکٹر نے کمرہ سے نکل کر کرم علی سے کہا۔

"سید اکرام حسین کو ہمارا سلام بولو اور بولو ہم اُن سے ملنے آئے گا۔"

کرم علی ادھر چلے اُدھر اُس نے مقامی کلکٹر اور سپرنٹنڈنٹ پولیس کو چٹھی لکھی۔

"سیتا پور کے بلوائی جنھوں نے مسٹر اسٹیل کو قتل کیا تھا سرائے میں موجود ہیں جلد آئیے تو ساتھ چل کر ان کو گرفتار کر لیں۔"

پندرہ منٹ کے اندر تین انگریز افسر اور کچھ پولیس کے جوان سرائے میں پہنچے اور بھیا کو ان کے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ گرفتار کر لیا۔

بھیا جنھوں نے اپنی انسانیت و شرافت سے مجبور ہو کر ایک انگریز کے بال بچوں کی جانیں بچائی تھیں اس کے مقابلہ میں اب اسی کے داماد کا اپنے ساتھ یہ ظالمانہ سلوک دیکھ کر دنگ رہ گئے انھوں نے کچھ کہنا چاہا مگر انگریزوں نے ڈانٹ کر کہا۔

"ہم کچھ سننا نہیں مانگتا الٰہ آباد میں تمھارا فیصلہ سنایا جائے گا۔"

جس طرح ممکن ہو سکا کرم علی جلد سے جلد نگرسن پہنچا۔ ہم لوگوں کو اس حادثہ کی اطلاع دی۔ سارے گھر میں کہرام مچ گیا۔

مسٹر اسٹیل کی بیوی اس وقت الٰہ آباد ہی میں تھیں۔ جب انھوں نے سنا کہ سیتا پور کے بلوائی پھانسی کے لیے لائے گئے ہیں تو وہ آئیں کہ اپنے شوہر کے قاتلوں کو سولی پاتے دیکھ کر اپنا کلیجہ ٹھنڈا کر لیں۔

میم صاحب اس وقت پہنچیں جب پہلے ملزم (بھیا اکرام حسین) کا مقدمہ فیصل ہو چکا تھا۔ ادھر افسر نے پھانسی کا حکم سنایا اور برق انداز نے فوراً ان کو سولی کے تختہ پر چڑھا دیا۔

میم صاحب کی نظر جب اکرام حسین پر پڑی تو بے تحاشا چیخ اُٹھیں۔

ٹھہرو، ٹھہرو۔ یہ قاتل نہیں ہیں۔ یہ تو ہمارے بہت بڑے محسن ہیں۔" مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ بھیا کی روح پرواز کر چکی تھی۔ اس لیے بھیا کی روح لے جانے والے فرشتوں نے میم صاحب کو غالباً جواب دیا ہو گا کہ ہاں میم صاحب آپ کے یہاں احسان کا بدلہ اسی طرح دیا جاتا ہے۔"

سولی کے تختہ سے جب لاش اُتاری گئی تو عزیزوں نے لاش دفن کرنے کو مانگی مگر فرنگیوں نے لاش تک عزیزوں کو دینا روا نہ رکھا بلکہ اُسے دریا میں ڈال دیا جسے مچھلیوں نے کھا ڈالا۔

مچھلی دیکھ کر بھیا کی لاش میری آنکھوں میں پھرنے لگتی ہے جسے مچھلیاں کھا گئیں۔

دادی اماں نے یہ ساری کہانی کچھ ایسے درد کے ساتھ سُنائی کہ اس کے بعد سے میرا دل بھی مچھلی سے ہمیشہ کے لیے پھر گیا۔

گاڈں کے طلسمی کوہساروں کے لامتناہی سلسلے اپنی آغوش میں ان گنت دلفریب نظاروں کا سماں چھپائے ہوئے ہیں۔ ان تمام خوشگوار جگہوں میں نینی تال سب سے زیادہ دیدہ زیب ہے۔ کاٹھ گودام ریلوے اسٹیشن سے ۳۵ کیلومیٹر دوری کا یہ راستہ پختہ پہاڑی سڑکوں سے ملایا گیا ہے جس پر یو۔ پی روڈ ویز کی آرام دہ بس سروس ہر وقت دستیاب رہتی ہے۔ گڑھ مکتیشور نامی مقام پر دریائے گنگا کے اوپر پُل بن جانے سے دہلی سے بھی سڑک کا راستہ طے کرنے میں مزید سہولت پیدا ہوگئی ہے۔ اس کے علاوہ نینی تال سے ہفتہ میں تین بار ہوائی سروس کا بھی باقاعدہ انتظام ہے۔

سات چمکدار برف پوش چوٹیوں کے زیرسایہ ایک خوشنما جھیل کے چاروں طرف پھیلے ہوئے ہرے بھرے پہاڑی ڈھلوان پر آباد نینی تال چھٹیاں گذارنے والوں اور سیاحوں کی ایک محبوب آماجگاہ ہے۔ انگریزوں کے زمانے میں آباد کیا ہوا یہ پُرفضا شہر صوبائی حکومت کا موسم گرما کا صدر مقام بھی رہ چکا ہے۔ اگرچہ اس جگہ کا تذکرہ قدیم تاریخی کتابوں اور پُرانوں میں بھی ملتا ہے مگر اس کا موجودہ نام نینا دیوی کے مندر سے منسوب ہے۔ جو جھیل کے ایک کنارے پر واقع ہے۔ نینا دیوی کے مندر کے قریب واقع مسجد، گرجا اور گردوارے جھیل کے گرد آباد اس شہر کی مذہبی تصویر کے مختلف خدوخال نمایاں کرتے ہیں۔

اس مقام کی جدید تاریخ کا سلسلہ ۱۸۴۱ء سے شروع ہوتا ہے۔ جب بیرن (BARREN) نامی ایک انگریز جو اس پُر فضا مقام سے حد درجہ متاثر ہوا تھا۔ یہاں آکر ٹھہرا۔ یہاں کے خوبصورت مناظر نے اُسے اس قدر مسحور کیا کہ اُس نے "آگرہ اخبار" میں اس جگہ کی تعریف ان الفاظ میں بیان کی ہے۔" ہمالیہ کے ۱۵۰۰ میل لمبے علاقے میں کوہ پیمائی کے دوران مجھے اس سے زیادہ خوبصورت مقام اور کہیں نظر نہیں آیا۔"

چاروں طرف پہاڑیوں سے گھری ہوئی بیضاوی شکل کی ایک میل لمبی جھیل نینی تال کی جان ہے۔ جھیل میں کشتی کی سیر۔ پیراکی اور مچھلی کے شکار کی سہولتیں سیاح کا دل موہ لیتی ہیں۔ سطح آب پر بطوں کی مانند رواں دواں کشتیاں اور قوسِ قزح کی طرح بدلتا ہوا جھیل کا رنگ نا قابلِ فراموش سماں پیش کرتا ہے۔ شام کے وقت جب شہر کی سرگرمی اور رہا ہمی ختم ہو جاتی ہے تو برقی قمقموں سے منوّر جھیل ایک مسحور کن پرستان میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

موسم بہار میں نینی تال سہ رنگے لباس میں لپٹا نظر آتا ہے۔ آسمان پر بادل کے ٹکڑے بھی مشکل نظر آتے ہیں۔ یہاں کے اس موسم کی چاندنی راتیں بڑی سُہانی ہوتی ہیں۔ بادِ بہاری اور نسیم سحر کے فرحت بخش جھونکے چاروں طرف کوہساروں سے چلتے ہیں۔ جھیل کی لہروں کے سُریلے نغمے اس موسم میں چار چاند لگا دیتے ہیں۔ ننھی ننھی چڑیوں کے چہچہانے کی آواز، جھرنوں کے دلکش راگ ایک والہانہ فضا پیدا کر دیتے ہیں ایسی حسین فضا میں چند دن گزارنے کے بعد اس مقام کی دلکشی کو زندگی بھر نہیں بُھلایا جا سکتا۔

انھیں خوشگوار ایّام میں یہاں کے لوگ موسمِ بہار اور موسمِ گرما کے مشہور تہوار بڑے ذوق و شوق سے مناتے ہیں۔ اُن کے ثقافتی پروگرام جن میں رقص، موسیقی، ڈرامے، آتش بازی اور طرح طرح کے کھیل شامل ہیں زندگی کے لئے ایک انوکھی راحت اور سکون مہیا کرتے ہیں۔ یہاں کے دلچسپ رنگا رنگ علاقائی رقص ان ثقافتی پروگراموں کی رُوح ہیں۔

ان تمام پروگراموں کا مرکز یہاں کے خوبصورت فلیٹ ہیں جو جھیل کے بالائی سطح کے کشادہ علاقے میں دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں بڑے بڑے کھیل کے میدان۔ ننھے بچّوں کے کھیلنے کے پارک۔ بس اسٹینڈ۔ فوّارے۔ سینما گھر اور طرح طرح کے کلب بھی شامل ہیں۔ "راج بھون" ایسی مشہور و معروف سرکاری عمارت مع اپنے وسیع اور پُر فضا باغ اور گولف کے میدان کے اسی علاقے میں واقع ہے۔

یہاں قیام کرنے کے لئے متعدد آرام دہ ہوٹل ۔ بورڈنگ ہاؤس اور خوبصورت کاٹج ہیں جو جھیل کے کنارے پہاڑیوں کے دامن میں بنے ہوئے ہیں ۔ یہیں اُتر پردیش حکومت کا تعمیر کردہ "سیاح گھر" بھی ہے جو متوسط طبقہ کے لوگوں کے لئے مناسب قیمت پر ٹھہرنے، کھانے اور رہنے کی سہولت مہیا کرتا ہے ۔ جھیل کے دونوں بازوؤں یعنی تلی تال اور ملی تال میں واقع دیدہ زیب دوکانیں ۔ چائے خانے ۔ اور کافی ہاؤس لوگوں کو ضرورت کی چیزیں فراہم کرتے ہیں ۔

صحت بخش اور تھکن دور کرنے والے گندھک کے ایک چشمے کے ساتھ ساتھ نینی تال میں سیاحوں کے لئے اور بھی بہت ساری تفریح گاہیں موجود ہیں جو زیادہ تر پہاڑی چوٹیوں پر واقع ہیں ۔ جن کا نظارہ نہایت دلفریب ہے ۔ دُور دُور تک پھیلے ہوئے ہرے بھرے پیڑ، سانپوں کی طرح بل کھاتی ہوئی سڑکیں اور پگھلی ہوئی چاندی کی طرح رواں دواں چشمے نہایت دیدہ زیب معلوم ہوتے ہیں ۔ پہاڑیوں کے اس لامتناہی سلسلے میں "چائنا پیک" سب سے زیادہ اونچی چوٹی ہے ۔ جو ۸۵۶۸ فیٹ کی بلندی پر واقع ہے ۔ یہاں سے نینی تال اور ہمالیہ کی گود میں واقع نندا دیوی اور ترسول نامی برف پوش چوٹیوں کا نظارہ بھی بڑا ہی دلچسپ معلوم ہوتا ہے ۔ یہاں سے طلوع اور غروب آفتاب کا سماں بھی بڑا رنگین نظر آتا ہے ۔ اس جگہ پر رات میں قیام کرنے کے لئے ایک ہوٹل اور لکڑی کا کمرہ بنا ہوا ہے ۔

نینی تال کوہ پیمائی اور سیاحت کے لئے ایک عمدہ مرکز ہے ۔ یہاں سے چند میل کے فاصلے پر کئی تفریح گاہیں ہیں ۔ جن میں حسب ذیل سب سے زیادہ مشہور ہیں :-

"بھیم تال" جہاں ایک نیلگوں پانی کی جھیل کے درمیان زمرد جیسا ہرا بھرا جزیرہ ہے ۔

"سات تال" جو کہ سات چھوٹی بڑی جھیلوں کا سنگم ہے ۔

"نوکچھیا تال" جہاں کی خوشنما جھیل کے سات کنارے ہیں ۔ اور

"رام گڑھ" جہاں پھولوں سے لدے ہوئے باغات اور دلپذیر قیام گاہیں ہیں اور جو رابندرناتھ ٹیگور ایسے عظیم شاعر کا مسکن بھی رہ چکا ہے ۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ نینی تال ایک بہترین تفریح گاہ ہے ۔

(ٹریویلرا ن انڈیا کے شکریہ کے ساتھ)

واجدہ تبسم

خالہ بی یوں تو مرغی کے چوزوں کو دانا چگا رہی تھیں۔ مگر ان کا سارا دھیان دھوبی کی طرف تھا۔

صحن میں ڈھیر سارے کپڑے پھیلے ہوئے تھے اور سنجلی بہو بلقیس کپڑے لکھتی بیٹھی تھیں۔ سنجلی بہو کا کام بھی کیا تھا، جدھر لپکتیں سارا معاملہ چوپٹ۔ یوں کرنے دھرنے کا شوق توڑا تھا مگر کوئی کام گت سے نہ کر پاتیں۔ پچھلے چکر میں دھوبی کو کپڑے دینے بیٹھیں تو اچکنوں اور قمیصوں کی جیبیں تک نہ دیکھیں۔ ہوتا کیا، اختر میاں کی اچکن کی جیب میں دس دس کے تین نوٹ تھے۔ وہ دھوبی کے گھر چلے گئے۔ دھوبی تھا تو پہچان کا، برسوں سے کپڑے لاتا لے جاتا تھا، مگر تیس ۳۰ روپیہ دیکھ کر اس کی نیت بدل گئی۔ صاف، مکر گیا کہ میں نے دیکھے ہی نہیں، دیکھتا تو واپس نہ کر دیتا؟

خالہ بی کا غصہ بہو پر تھا اور بہو کا غصہ جیٹھ پر۔

"اے واہ اتنا بھی نہیں ہوتا کہ کپڑے اُتارتے وقت اپنی جیبوں کی تلاشی لے لیں۔"

"اور تم سے اتنا بھی نہیں ہوتا کہ کپڑے دیتے وقت ذرا جیبوں کا جھٹکا ہی لے ڈالیں

مرد تو مرد ہی ٹھہرا، آخر عورتوں کا اور کام ہوتا ہے بی؟ اُلٹے غصہ دکھاتی ہو۔"

تب کی بات بہو بیگم کو یاد تھی۔ ہر کپڑے کو بڑی احتیاط سے جھٹکوا رہی تھیں۔ خالہ بی الگ دیکھ رہی تھیں۔ اک دم بلقیس نے ایک اچکن کی جیب سے ایک پوٹلی برآمد کرلی۔

جلدی جلدی گرہ کھول کر دیکھا۔ دو دو پیسے میں ملنے والی دو گلابی پلاسٹک کی پیپنیاں اور ننھے بچے کے منہ میں دینے کا ایک ربر کا نپل!

"اماں دیکھتی ہیں یہ کیا ہے؟" اُنھوں نے منہ میں ڈال کر زور سے ساس کے کان کے پاس پیپنی بجا دی۔ "کیا ہے؟" خالہ بی نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ کھلونے!"

"تو کیا ہوا۔؟ ــ خالہ بی جواری کے دانے آنگن میں پھینکتی ہوئی بولیں، "ڈھیر سارے تو بچے ہیں گھر میں، کسی کے بھی ہوں گے۔ رکھ دو وہاں میز پر۔"

"بات تو سمجھتی نہیں آپ۔ یہ چھوٹے بھیا کی جیب سے نکلے ہیں۔" وہ چھوٹے بھیا پر زور دے کر بولیں۔

"اس میں سمجھنے کی کیا بات ہے؟ نکلے ہوں گے چھوٹے ہی کی جیب سے۔ پھر؟"

بلقیس جھلا گئی۔ "تو کیا کوئی بات ہی نہیں ہوئی؟"

"جا چھوکری تیری تو عقل ہی پلٹ گئی ہے۔ ارے اتے سارے بھائی بھتیجے ہیں، کسی کے لئے بھی لایا ہوگا۔"

"بھائی بھتیجوں کے لئے لاتے تو دے نہ دیتے، گرہ لگا کر کیوں رکھتے؟"

اب کہ خالہ بی نے ذرا غور سے بہو کی صورت دیکھی۔ "دلہن تمہارا مطلب میں اب بھی نہیں سمجھی۔"

"اب آپ جان بوجھ کر انجان بن رہی ہیں تو میں کیا کروں۔" وہ اُکتا کر پھر کپڑوں پر پل پڑیں۔

خالہ بی کا سارا قصہ اُس رانی جیسا تھا جس کے ایک نہ دو پورے سات بیٹے تھے اور یہ تو ہوتا ہی تھا کہ سب سے چھوٹا بیٹا بے حد خوبصورت اور بے حد ذہین ہوتا تھا۔ (بہادر ہونا تو خیر لازمی تھا) ملک ملک کی خاک چھانتا اور پھر شہزادی بدرِ کمال یا پھر شہزادی گل رُخ کو کھوج نکالتا۔ بڑی دھوم دھام سے راجدھانی کو لوٹتا تو ساتھ میں اپنے باپ کی چھنی ہوئی سلطنت

بھی دوبارہ حاصل کرتا آتا ۔ بس چھوٹے میاں کا بھی عن و من وہی حشر تھا۔ سب میں چھوٹے تھے، سب میں خوبصورت اور کہانی کے شہزادے کی طرح ماں باپ کے لاڈلے بھی ۔ اوپر کے چھ بیٹوں کی تو شادی ہو گئی، مگر چھوٹے میاں ابھی کنوارے ہی تھے ۔ عمر بھی بہت کہاں تھی، بس یہی کوئی چوبیس پچیس کے اندازے میں تھے ۔

وضعدار گھرانوں میں ہوتا ہے کہ ماں باپ جہاں بات لگادیں، بیٹے بغیر کسی پس و پیش کے سر جھکا دیتے ہیں ۔ اور یہ بات تو ظاہر ہے کہ ماں باپ پیٹ کی اولاد کا برا کیوں چاہیں گے؟ ان کی بات نہ ماننے کو کوئی تو حوالہ ہو ۔ خالہ بی کی ساری بہوئیں اپنے ہی خاندان کی تھیں۔ کوئی ماموں کی بیٹی کی نند، کوئی خالہ زاد بہن کی بیٹی، کوئی بھتیجی تو کوئی بھانجی۔ خالہ بی کا گھر بھرا پڑا تھا۔ چھوٹے میاں کی شادی کی ابھی ضرورت ہی کیا تھی ؟ ۔ مگر وہ جو ہر ماں کی خواہش ہوتی کہ "بس بیٹے کا سہرا دیکھ لوں" وہی خواہش یہاں بھی اُبھری، بیٹی تو دیکھی بھالی ہی تھی ۔ بڑی بہو کی چھوٹی بہن، خالہ کی آنکھوں میں اب تب سے نہیں اس وقت سے چڑھی ہوئی تھی جب بڑے بیٹے کی آرسی مصحف کے وقت لال لال اطلس کا جھم جھماتا جوڑا پہنے ایک چھوٹی سی لڑکی صندل کی کٹوری لئے اور آتے ہی اڑ بھنگے پن سے بولی: ۔

"بھیّا! ہم آپ کے صندل لگائیں گے تو نیگ دیں گے نا آپ ؟ "

اتنی پیاری صورت، ایسی بھولی ادائیں کہ سارے لوگوں کی نگاہیں جیسے اس پر جم گئیں اور تو جانے کتنوں نے کیا کیا سوچا ہوگا۔ مگر ادھر خالہ بی نے تو بس تہیہ ہی کر لیا کہ سیانی ہوتے ہی اُسے بھی اپنے گھر کا اُجالا بنالوں گی۔ مگر بات اپنے دل ہی میں رکھی ۔

بڑے گھروں کے کھاتے پیتے بچّے جلد ہی جوان ہو جاتے ہیں اور پھر لڑکیاں تو یوں ہی شرط باندھ کر بڑھتی ہیں ۔ کوئی سال بھر بھی نہ گزرا ہوگا کہ بڑی دلہن کے میکے سے بُلاوا آیا۔ بھائی لینے کو آئے ۔ اب بہن بڑی حیرت زدہ کہ ہائے اللہ کوئی کار نہ کاج، تقریب نہ جلسہ، یہ میٹھے بٹھائے بلاوا کاہے کو آیا ؟ بھائی سے پوچھا تو یہ بھی بس اتنا ہی بولے : ۔

" مجھے تو معلوم نہیں ۔ اماں نے کہا جا کر لے آؤ ۔ بس میں چلا آیا "

دُلہن تو کچھ نہ سمجھیں، مگر خالہ بی ہنسنے لگیں ۔

" اے دلہن تم بھی بس پوری وہ ہو ۔ اتنی بات نہیں سمجھتیں، لڑکی ذات کا معاملہ ہے اب کیا سمدھن پورے خاندان میں رقعے بانٹ بانٹ کر دوپٹہ اڑھائیں گی بٹیا کو ؟ چلی کیوں نہیں جاتیں "

بات وہی نکلی جو خالہ بی نے سمجھی تھی، ماں باپ تو فکر مند ہوئے ہوں گے کہ چھاتی پر بوجھ پڑا، مگر خالہ بی کے ایک دل کے ہزار دل ہو گئے کہ چلو اب بہو اپنی ہوئی۔

ادھر یکے بعد دیگرے سب بھائی دلہے بن گئے تھے اور بیچ کے دو بھائیوں کے منڈوے بھی ساتھ ساتھ پڑے، نکاح خوانی بھی ساتھ ساتھ ہوئی اور اپنی اپنی دلہنوں کو گود میں اُٹھا ساتھ ہی ساتھ پالکی میں بٹھایا۔ اب رہے کون؟ وہی چھوٹے میاں! اب چھوٹے میاں تو لاڈ دلار کے تھے ہی۔ پہلے اور آخری کاج پر تو یوں ہی زیادہ دھوم دھڑکا ہوتا ہے، اور چونکہ چھوٹے میاں اپنے بھائیوں کے مقابلے میں زیادہ پڑھ لکھ بھی گئے تھے، اس لئے بھی ان کے وقت زیادہ ہنگامہ ہونا ٹھہرا۔

خالہ بی کو کیا اپنے بیٹوں سے ایسی امید ہو سکتی تھی کہ ان کے ہاں کرتے وہ نا کریں؟ پوچھیں گچھیں بھی کیوں؟ رمضان کی عید کے بعد پیغام بھجوا دیا۔ غیر خاندان کے ہوں، چال چلن میں کھوٹ چوٹ کا ڈبکا ہو تو جواب میں دیر ہوتی ہے۔ چھان بین کرتے کرتے ہی دن نکل جاتے ہیں۔ یہاں تو اپنے ہی گھر کی سی بات تھی۔ بقرعید کے بعد جواب بھی مل گیا اور چھوٹے میاں کو پتہ چلا تو کب چلا جب خالہ بی نے منگنی کے پھول پہنانے اُنھیں مسند پر آ بیٹھنے کو کہا۔

"مگر کس تقریب میں؟" اُنھوں نے ہنس کر کہا۔

"اے چل باتیں بناتا ہے۔ اب اتنا بھی پتہ نہ چلا ہو گا کہ یوں اترا کر پوچھ رہا ہے۔"

چھیوں بھابیاں ہنستی کھڑی تھیں۔ سنجلی بھابھی بلقیس ہنس کر بولیں:۔ "اس لئے کہ اب چھوٹے شہزادے کی باری ہے۔"

سب ہنسنے لگے مگر چھوٹے میاں پھر بھی نہ سمجھ سکے۔

"مگر کاہے کی باری بھئی؟"

"اجی جناب اب آپ کے دولہا بننے کی باری ہے۔"

ادھر قہقہے اُڑے اور اُدھر ان کا جی ڈوب گیا۔

"مگر — مگر مجھ سے کوئی پوچھتا تو؟"

"اے چل بڑا آیا۔ ہم سے بڑھ کر تیری عقل ہو گئی شاید" اماں بڑے پیار سے ہنس کر

بولیں: "وہ بھلا پوچھتے بھی تو کیا جواب دیتا؟ کیا نا کر دیتا۔؟"

چھوٹے میاں نے منگنی کے پھول پہنے تو سہی، مگر نئے نئے دُلھوں پر ایسے موقعوں پہ جو خوشی چھپاتی ہے وہ ان کے چہرے پہ دور دور تک نہ ملتی تھی۔

بیٹی والوں کا منہ ان کے بس کا نہیں ہوتا۔ بیٹے والے کچھ کہیں تو جواب دیں، ورنہ منہ پھوڑ کر تو بول نہیں سکتے۔

"بات تو ہو بھی گئی بھئی، اب بیٹی اُٹھا کیوں نہیں لیتے؟"

ادھر بیٹے والے ایسے ملے تھے کہ سر سر مہینے گزرتے جارہے ہیں، نہ ہوں نہ ہاں۔ اِدھر اُدھر سے پتہ بھی چلایا، مگر نہ کھلی۔ پھر بڑی بہن کی زبانی معلوم ہوا کہ چھوٹے میاں اپنی ٹریننگ میں الجھے ہوئے ہیں۔ ٹریننگ ختم ہوئی تو ملازمت کریں گے، پھر کہیں جا کر شادی وادی کے بارے میں سوچیں گے۔ صرف سوچیں گے، کرنے کا پھر بھی طے نہ تھا۔

باپ کا بچوں پر وہ رُعب تھا کہ ان کے سامنے آتے ہی کانپنے لگتے۔ اور ادھر وہ گھر میں گھسے اور بچے ادھر اُدھر کھسکے۔ خالو میاں چاہتے تو آج ہاتھ پکڑ کر منڈوے تلے بٹھا دیتے "بول بے قبول ہے لڑکی؟" اور میاں جی کی اتنی مجال نہ ہوتی کہ ناپسند ہونے پر بھی انکار کر سکتے مگر خالو میاں نے جو دیکھا کہ چھوٹے میاں ٹریننگ کے بوجھ سے یوں ہی سوکھے جارہے ہیں، بس ڈھیل دے دی۔

"کام کا بار آپڑا ہے بے چارے پر۔ ایسے میں گرہستی میں الجھا دیں تو صحت بالکل ہی تباہ ہو کر رہ جائے گی۔ اور کیا ابھی سے بوڑھا تو ہونے نہیں جارہا ہے۔"

دیوروں، بھاوجوں کی محفل جمتی تو رنگا رنگی باتیں ہوتیں۔ سنجلی بہو سدا ساس کے دل پر چڑھی رہنا چاہتی تھیں اور موقع ملنے پر کوئی نہ کوئی ایسی بات ساس سے جا لگاتیں کہ وہ اُنھیں اور زیادہ چاہنے لگتیں۔ مگر اس دن خالہ بی نے بلقیس دلہن کی بات پر کان ہی نہ دیئے۔ جب اُنھوں نے جا کر سنایا:۔ "اماں سنا کچھ، چھوٹے بھیا تو کہتے ہیں میں تمام عمر شادی ہی نہیں کروں گا"۔ اماں نے چونک کر دیکھا۔

"دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا!"

"اے لو میرے دماغ کو کیا ہونے چلا ہے؟ چھوٹے میاں آپ ہی کہتے تھے۔ سو میں نے آپ سے کہہ دیا"

"مگر کوئی وجہ بھی ہوتی ہے؟"

"اب یہ تو ان کا اپنا دل جانے۔"

"بات میں کوئی ڈھنگ بھی ہو مگر۔"

بلقیس بی ہنس کر بولیں:۔ اماں کہانی والے شہزادے کی طرح وہ تو کوئی شہزادی ہی لائیں گے۔"

خالہ جی بدک کر بولیں:۔ کیوں بانو کیا کسی شہزادی سے کم ہے۔؟"

"اب تو وہی جانیں جو انکار پر تلے بیٹھے ہیں۔"

بات یہیں ختم نہیں ہوئی، بس خالہ بی کے جی کو لگ گئی۔ چھوٹے میاں گھر میں آتے تو خالہ بی ایسی کوری کوری نظروں سے ان کا جائزہ لیتیں کہ اپنی جگہ وہ بھی ٹھٹھک رہ جاتے۔

ایک دن رات کے کوئی گیارہ بجے چھوٹے میاں گھر لوٹے۔ سب لوگ سو چکے تھے۔ ملازم باہر ہی سوتا تھا۔ اس نے بڑے دروازے کی کنڈی کھول دی اور یہ گھر میں آگئے۔ خالہ بی کو تو مانوس قدموں کی چاپ سن کر سونا دوبھر ہو گیا تھا۔ سر اٹھا کر بولیں:۔

"کہاں گیا تھا چھوٹے میاں؟"

چھوٹے میاں پہلے تو ذرا گڑبڑائے پھر سنبھل کر بولے:۔ "رات کا شو دیکھنے چلا گیا تھا۔"

"اور مجھ سے پوچھا بھی نہیں؟"

"بھول ہو گئی اماں بی۔ دوستوں نے گھیرا اور بس لے کر چلے ہی گئے۔"

خالہ بی نے بھی کوئی دھیان نہ دیا کہ جوان جی ہے ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر نگرانی ٹھیک نہیں ہوتی۔ مگر اس دن کے بعد تو یہ ہونے لگا کہ چھوٹے میاں کو روز ہی دوست گھیرنے لگے۔ کریم ان کا یار غار بن گیا کہ وہ دبے پاؤں راتوں کو آتے اور یہ دھیرے سے دروازہ کھول دیتا۔

رمضان کے تیس روزے ختم ہو چکے تھے۔ جمعہ کو عید پڑھنی تھی۔ جمعرات کی رات خالہ بی اپنی تمام بہوؤں کے ساتھ شیر خورمے اور سیویوں کے لئے میوے تیار کرتی بیٹھی تھیں۔ ایسے کام کاج میں تو رات یوں بیت جاتی ہے۔ ادھر صبح ہی صبح ننھے بچے کپڑوں کے لئے غل غپاڑہ مچانا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر بڑے لوگوں کی بھی برابری کرنی ہوتی ہے۔ نمازیوں کی گڑبڑ، پھر خود عورتوں کے نہانے دھونے۔ سب مائیں اپنی اپنی بچیوں کے ریشمی رنگین

اور بچوں کے گلابی نیلے کپڑے اور اچکنیں نکال نکال کر اوپر ہی رکھ رہی تھیں کہ صبح صبح پھر گڑبڑ نہ مچے۔

چھوٹے میاں کو معلوم نہ تھا کہ آج گھر بھر میں رت جگا پڑا ہے۔ یوں ہی اپنے تیئیں دھیرے سے دروازہ بند کرتے ہوئے گھر داخل ہوئے تو سٹ پٹا گئے۔ چراغوں کی دھما دھم روشنی میں دیکھتے کیا ہیں کہ اماں تو بن کشن پہ کھوپرہ چھیلتی بیٹھی ہیں اور بھابیوں نے مارے خوشی اور اودھم کے رات کو دن سمجھ رکھا ہے۔

خالہ بی نے دیکھا ضرور، مگر ٹال گئیں۔ اگر بولنے پر اتر آتیں تو پھر بولتے ہی چلی جاتیں اور پھر صبح عید کا دن تھا کہ برس کے برس یہ دن آتا ہے۔ اگر فضول میاں منہ پھلا کر بیٹھے رہے تو غصے غصے میں ساری خوشی ملیا میٹ ہو جائے گی۔ سمجھانے بجھانے کے اور بھی تو کئی دن ہوتے ہیں! بس اتنا ہی بول کر رہ گئیں :۔ "اے میاں یہ کوئی آنے کا وقت بھی ہوا؟ دیکھ لو دو ڈھائی سے کم کیا بج رہے ہوں گے؟ اور پھر اپنے کھانے دانے کا بھی کوئی خیال ہے کہ نہیں؟ روزہ کہاں افطار کیا تھا؟"

چھوٹے میاں کے دم میں دم آگیا۔ سانس لے کر بولے :۔ "ایسے ہی ایک دوست نے روک لیا۔"

"اتنی رات گئے تک؟" خالہ بی حیرت سے بولیں۔

"اور کیا۔ اتنا کہتا رہا جانے دو، جانے دو، مانا ہی نہیں، میں تو تب ہی چلا آتا تھا۔"

"اچھا دوست ہے موا۔" خالہ بی اتنا کہہ کر کھوپرہ گھسنے لگیں۔ کرچے ہوئے بن بیٹ کر انھوں نے تھال میں رکھ دیئے، اور خود جا کر سماوار سے ٹونٹی کھول دی اور وضو بنانے لگیں۔ خالہ بی ہر جمعرات کی رات کو سوتے وقت یٰسین شریف پڑھتی تھیں کہ گھر میں رزق کی برکت ہوتی ہے۔ بچپن کی عادت بڑھاپے تک ساتھ دے گئی۔ وضو بنا کر اٹھیں تو دیکھا کہ ان کا اپنا قرآن شریف طاق سے غائب ہے۔ چڑ کر بولیں :۔

"توبہ ہے۔ ان بچوں نے کسی چیز کا ٹھکانا نہ رکھا۔ میرا کلام مجید کس نے اٹھایا؟" منجھلی دلھن کے بچے سارے گھر میں اپنی شرارتوں کی وجہ سے بدنام تھے، یہ طعنہ تو صاف ان ہی پر جاتا تھا۔ الجھ کر بولیں :۔ "ابا میاں لے گئے تھے، بھلا بچے کیوں اٹھاتے؟"

"اور ابا میاں کیوں لے گئے تھے؟"

"یہ وہ خود جانیں، کوئی کیا کہے؟"

بلقیس دلہن بولیں :۔ "اُنھوں نے اپنا والا کلام مجید ایک مانگنے والے کو دے دیا۔ بے چارے کی ماں مرگئی تھی تو وہ کچھ پڑھ کر بخشنا چاہتا تھا، اور گھر میں کلام مجید نہ تھا، سوابا میاں نے کلام مجید دے ہی دیا؟"

"اچھا کیا، مگر اب میں کاہے میں تلاوت کروں" گردن اونچی کرکے دیکھا تو طاقچے تک ان کا ہاتھ نہ جاتا تھا، آواز دے کر بولیں :۔ "اَرے چھوٹے ذرا یٰسین شریف تو اُتار یو۔"

چھوٹے میاں آواز سن کر آتو گئے تھے، مگر یہ بات سن کر وہیں رہ گئے۔ کِنما کر بولے :۔ "میں با وضو نہیں ہوں۔"

"اے میاں تو سامنے ہی تو سماوار دھرا ہے، وضو کو ایسے کون گھنٹے لگتے ہیں؟"

منٹ بھر تو یوں ہی اُلّووں کی طرح کھڑے رہے، پھر بولے :۔

"میں باہر سے ابھی منٹ بھر میں آتا ہوں۔"

اللہ جانے وہ منٹ کتنے گھنٹے کا تھا کہ خالہ بی کی ٹنگریاں دکھ دکھ گئیں۔ اوب کر اپنی بہوؤں سے بولیں :۔

"دوئی دیکھاری لڑکیو! میں یہاں کھڑی کی کھڑی ہوں اور وہ موا ایسا غائب ہوا کہ پلٹا ہی نہیں۔"

بلقیس نے دالان والے کمرے میں جاکر کھڑکی سے مردانے میں جھانک کر دیکھا تو چھوٹے میاں خرخر کرتے پڑے سو رہے ہیں۔

آج خالہ بی کا ماتھا پہلی بار ٹھنکا۔ انھیں یاد آیا ابھی کچھ ہی دن پہلے حضرت کے نام کی فاتحہ دلوائی تھی، خالہ بی لاکھ بلاتی رہیں مگر چھوٹے میاں یوں ہی مکر گانٹھے پڑے رہے۔ ذرا ٹس سے مس نہ ہوئے۔ بستر ے میں لمبے لمبے پڑے ہی رہے۔ لاکھ لاکھ ماں نے خود خوشامد کی :۔

"ارے موئے فاتحہ میں تو شامل ہو جا، برکت اُترتی ہے۔"

کس کی فاتحہ؟ کہاں کی برکت؟ وہ تو ہلے بھی نہیں۔ بڑی دیر بعد اُٹھے بھی تو پہلے غسلخانے کی خبر لی۔ نہا دھو کر سفید براق کپڑے پہنے اور ماں سے آکر بولے :۔

"کھلایئے کیا پکایا ہے!" خالہ بی نے غور کیا تو یاد آیا کہ صاحب زادے رات کو پھر

دیر سے لوٹے تھے۔

بھابیوں میں بات جا پہنچی اور طرح کی قیاس آرائیاں ہونے لگیں۔ خالہ بی بھی جا پہنچیں۔

"اماں تو مانتی ہی نہیں، میں کہتی ہوں حضرت بُری باتوں میں پڑ گئے۔"

خالہ بی کو بھڑک کر غصہ آ گیا: "اے میں کہوں جوان بچّہ ہے، گھر میں جورو نہیں بچہ نہیں، ایسے میں اگر گانا وانا سُننے کہیں چلا گیا تو کیا بُرائی ہو گی؟"

"گانے والے کا نام نہ لیجیئے اماں بی۔" منجھلی دلہن بولیں،

"صاف سیدھی طرح کہیئے نا کہ کوٹھے پر گئے تھے۔ فاتحہ تک میں تو شامل نہیں ہوئے۔ اور پھر یہ سب کیا ہے۔؟ راتوں کو گیارہ۔ بارہ، ایک سے پہلے تو لوٹتے نہیں۔ چپ نام کر رکھا ہے کہ ٹریننگ لے رہے ہیں۔ ٹریننگ ہے نہ ورننگ۔ دوسری ہی ٹریننگ لے رہے ہیں۔"

"ہاں، میں بھی آنکھیں رکھتی ہوں۔ اور کیا ہم نے بھی ڈھیر سارے بچے کچھ یوں ہی نہیں جن لئے ہیں۔ ہزار بار دیکھا ہے کہ جب تک نہا دھو نہ لیں نماز کے کمرے میں پھٹکتے تک نہیں ہیں۔ اسے تو کوئی اندھا بھی جان جائے کہ پانی کدھر کو بہہ رہا ہے۔ اب یوں کوئی آنکھوں پر پردہ ہی ڈالنا چاہے تو کیا کہہ سکتے ہیں؟" عزیز میاں کی بیوی نے صفا ساس پر چوٹ کی۔

عید کا دن نکلا، گھر بھر میں چہل پہل مچ گئی۔ رنگین ریشمی سرسراتے کپڑے، بچّوں کی چیخم چاخ، خالہ بی کا نوکروں پر گرجنا برسنا، بیبیوں کے سنگھار پٹار۔ بس سارے گھر میں دھمک دھیا ہونے لگی۔ یہاں وہاں، اِدھر اُدھر بس دھائیں دھائیں مچ گئی۔

دسترخوان بچھا، پورا گھر آ کر بیٹھا۔ خالہ بی نے طرح دے دی۔ اتنی اتنی باتوں پر روک کرنے سے بچے اور بگڑ ٹیل ہو جاتے ہیں۔ پیار دلار سے ہر ایک کو کھلا پلا رہی تھیں۔ چھوٹے میاں کھا تو کیا رہے تھے، بس نوالے ٹونگتے بیٹھے تھے۔ خالہ بی نے بوڑھی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا اور سمجھا کر ٹال ٹال گئیں۔

چھوٹے میاں یوں کھا رہے تھے جیسے نوالے حلق میں اٹکتے ہوں۔ ماں نے جبر کرنا شروع کیا تو یوں ہی اُٹھ کھڑے ہوگئے۔ "بھوک محسوس نہیں ہو رہی ہے اماں۔"

خالہ بی کے دل کو مستقل دھگدھگی لگ گئی۔

ذاکر میاں کی بیوی کو بس آج کے ہی چھن تھی کہ گھر بھر کی صفائی کرتی پھریں۔ مہینے

پندرہ دن میں جھاڑو لے کر اُٹھتیں اور پورے گھر کو کھود ڈالتیں۔ صفائی کرتے کرتے چھوٹے میاں کے کمرے کی باری آئی۔ کرسی ہٹائی، میز اُٹھایا، پلنگ اُٹھایا، الماری جگہ سے کھسکائی اور پھر جھاڑا جھکی کر کے، ایک ایک چیز سینت کر رکھنے لگیں۔ اتفاق سے الماری کا قفل رہ گیا تھا۔ پٹ کھولا، جالے گچھے گچھے بھرے ہوئے، نیچے اوپر دھول ہی دھول۔

"توبہ ہے اللہ! اتنی گندگی میں رہا کیسے جاتا ہے ان سے؟" الماری کے خانوں سے سامان اُٹھا اُٹھا کر نیچے رکھنے لگیں کہ خانوں کی صفائی ہو جائے تو چیزیں پھر اپنے ٹھکانوں پر پہنچ جائیں۔ دیکھتی ہیں تو سامنے ہی شہد کی شیشی اور ارنڈ کے تیل کی چھوٹی سی بوتل۔ پھر اِدھر اُدھر ہاتھ مارا تو چھوٹے چھوٹے موزے اور ننھی منی دو تین نیکریں اور بکڑ میں آ گئیں۔

"ہائے اللہ! سارا سامان ا جیسے کسی کی زچگی کی تیاری ہو۔" ان کی اپنی زچگی ہوئی تھی تو پہلے ہی دن اماں جان نے شہد منگوایا تھا، اور پھر یہ ارنڈ کا تیل؟ چھوٹے چھوٹے کپڑے اور یوں الماری میں چھپائے ہوئے۔!

ایک ہی چھپا کے میں وہ دیورانیوں جٹھانیوں کے جھتے میں بیٹھی ساری روداد سُنا رہی تھیں۔

"اور کیا ہم نے بچے نہیں جنے؟"

"وہی تو میں کہوں کہ شادی کے نام سے نئے گھوڑے ایسا بدکتے ہیں۔"

"ڈال لیا ہے کسی لڑی پڑی کو اپنے گھر۔"

بات اتنی بڑھی تھی کہ بلکے بیٹوں والی بہوؤں کے پیٹوں میں نہ رہ سکتی تھی۔ خالہ بی کو پھر بھی اپنا بیٹا ہی معصوم دکھائی دیا۔

"اے لو، حد ہو گئی! گھر میں بچے کچے ہیں ہی۔ خیال سے لے آیا کہ وقت پر کسی چیز کی ضرورت پڑے تو جلد ہی مل جائے۔ ایک تم ہو کہ طومار باندھے لیتی ہو۔"

"وہ تو آنے والا وقت آپ ہی بتا دے گا — ہاں۔"

دوسرے دن محض ساس کی چوم چوٹ پہ ذاکر میاں کی بیوی نے الماری کا پٹ کھولا تو سب چیزیں غائب تھیں۔ مطلب یہ کہ حق، حقدار تک پہنچ گیا تھا۔

اس دن کے بعد تو یہ ہونے لگا کہ آئے دن بہوئیں ساس کو قائل کرنے دیور کی چوری پکڑ تیں۔ کبھی جیب سے چپنی نکل رہی ہے تو کبھی کوٹ میں سے ربر کی چڑیا، کبھی مٹھائی تو کبھی نپل۔

خالہ بی جان بوجھ کر انجان بنی رہیں۔

خالہ بی کا ایک خیال تو اپنی جگہ یہ تھا کہ جان جوان جی ہے۔ اگر اِدھر اُدھر جھانک تانک کرلے تو برائی نہیں بلکہ قابلِ معافی ہے۔ مگر چھوٹے میاں تو اتنے دیوانے بن گئے تھے کہ سچ مچ کے دیوانے بھی ان کے سامنے سیانے تھے۔ اللہ جانے دل میں کیا سمائی، بانو کی معصوم جوانی پر رحم آیا یا خود اپنا ہی راستہ صاف کرنا تھا کہ پھوپھی کے یہاں جا پہنچے اور بولے :۔

"بانو بہن کے لئے میں نے ایک بہت اچھی جگہ بات لگائی ہے۔"

"بانو بہن!" پھوپھی بی حیرت سے چیخیں، "اے میاں ہونے والی بیوی ہے بہن بھانجی کا رشتہ باندھو گے تو نکاح کہاں قبول ہوگا؟"

"نکاح کرتا ہی کون کم بخت ہے؟ میں نے تو شروع ہی سے اسے اپنی بہن مانا ہے کیوں کہ اللہ نے مجھے خود کوئی بہن نہیں دی۔ وہی تو کہتا ہوں کہ بہن کا کچھ حق، بھائی پر لگتا ہے ایسی جگہ بات لگائی ہے کہ بہن بھی ساری عمر بھائی کو دعائیں دیتی رہے۔"

پھوپھی بی چھالیہ کی جگہ اپنی انگلی کتر گئیں۔ یہ گل بھی کھلنا ہی تھا، سو کھل کے رہا۔ بات چیت کا انداز ایسا سنجیدہ تھا کہ پھوپھی بی کو ہنسی مذاق کا کوئی پہلو نظر نہ آیا۔

چھوٹے میاں کے اپنے دوست تھے شمیم میاں، شہر میں تین تین دکانیں تھیں۔ عمر بھی بس ان کے لگ بھگ۔ چاہتے تھے کسی شریف خاندان کی کوئی بیٹی اٹھائیں۔ چاہے غیر ہی کیوں نہ ہوں۔ باپ مدت ہوئی مر چکے تھے۔ لے دے کے ایک ماں تھیں یا یہ خود، جو بھی بیٹی بیاہی جاتی لعلوں کی لعل رہتی، صورت شکل بھی ایسی کوئی بری نہ تھی۔ انھوں نے پھوپھی بی کو ایسی لچھے دار باتیں سنائیں کہ وہ بھی راضی جیسی ہو گئیں۔ اے اب جس کو بھرے دل سے بھر منہ سے بہن کہہ کر پکار لیا، لاکھ وہ خون کے رشتے بہن نہ ہوئی مگر پھر بھی بہن کا مان ہی اولیٰ ہوتا ہے۔ یہ تو حرام کرنا ہو گیا اور پھوپھی بی چھوڑ کوئی بھی اس بات پر کیا راضی ہو سکتا ہے کہ لے کر بہن کو بھائی سے بیاہ دیں۔ یہ تو دین دنیا دونوں میں روسیاہ کر دینے والی بات ہوئی۔ صاف صاف لفظوں میں چھوٹے میاں نے اونچ نیچ سمجھا دی کہ برائے خدا آپ بات کو یوں مشہور نہ کریں ورنہ لوگ تو ہوتے ہی ہیں ایسے کہ کسی کا بنتا کام بگاڑ دیں اور اس پر بھی یوں خوش ہوں جیسے کمال کر دیا ہے۔ کسی کا گھر جلے۔ بجائے بجھانے کے تاپنا شروع کر دیں۔

ایسے گپتا گپتی شادی کی تیاری شروع ہوئی کہ کسی کو پتہ بھی نہ چل سکا۔ سال چھ

جھیلنے کو بڑی بہو میکے جاتی تھیں۔ اب کے سے جو آئیں تو کیا دیکھتی ہیں کہ بھرے گھر میں ہلو رمچی ہوئی ہے، کپڑے گوٹے ٹھپے کا جیسے بازار کھلا ہوا ہے۔ بیٹھک میں سُنار بیٹھا ٹھک ٹھک کیے جارہا ہے۔

ادھر گودام میں اناج کی اُٹھا پٹک ہو رہی تھیں تو دیواروں پہ رنگ دار قلعی پھر رہی ہے۔ بات کا پتہ چلا تو ہک چک ہی رہ گئیں۔ مگر عقل سے سوچا تو پھر خوش ہو گئیں کہ چلو ٹھیک ہی ہوا۔

چھوٹے میاں کا کیا تھا؟ رات ڈھلے رات آنا، باؤلوں کی سی شکلیں بنائے پھرنا، نہ کھانے کی سدھ نہ پینے کا دھیان اور نہ ٹریننگ کے بعد بھی بڑے ملتے تو وہی تین چار سو روپلی یہاں تو بارش ہوتی تھی اور بڑی بات یہ کہ لڑکا اتنی چاہت سے کر رہا تھا! ذاکر میاں کے بڑے بیٹے کے ختنے ہوئے تھے۔ پورے دوست احباب جمع ہوئے تھے، پھوپھی بی بھی مدعو تھیں چھوٹے میاں نے غالباً آگے ہی سب طے کر رکھا تھا۔ لیکا جھپکی میں بانو کا دیدار شمیم میاں کو بھی کروا دیا اور وہ تھے کہ صحراوں کی خاک چھانے بنا ہی مجنوں ہو گئے۔

ادھر چھوٹے میاں کی ٹریننگ ختم ہونے میں دو ماہ رہ گئے تھے اور خالہ بی خوش پہ خوش تھیں کہ چلو خدا نے وہ دن بھی لایا کہ اب چھوٹے بیٹے کے پھول کھلتے دیکھیں گے اب شادی ہو گی تو آپ ہی سنبھل جائیں گے۔ اس دن بچوں کے گھیرے میں بیٹھی ہنس بول رہی تھیں کہ باہر سے ڈاک اندر بھجوائی گئی۔ نیلے تیلے رقعے نظر آئے تو خالہ بی نے بہوؤں کو آواز دی۔

بلقیس بی نے ایک رقعہ اُٹھا لیا اور بھچک ہو کر بولیں:۔

"ہائیں! یہ تو بڑے بھوپھا کی طرف سے ہیں"

"کس سلسلے میں مگر؟" خالہ بی چونک کر بولیں۔

"سلسلہ؟ سلسلہ ہی شادی کا"

"ہائیں؟" خالہ بی اور اچنبھے میں پڑ گئیں، "دوی بی کس کی شادی؟ کچھ آگے پڑھو گی بھی ——؟"

"صاف صاف تو لکھا ہے ——" سنجلی دلہن نے ایک کنگورے دار گلابی رقعہ سامنے نچا دیا اور زور سے پڑھنے لگیں: ——

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بتقریب

عقد سعید نور چشمی سلمہا

شرکت محفل عقد و تناول طعام کا متمنی

حاجی عنایت علی خاں

زمیندار

بتاریخ ۲ ذی الحجہ ۶۷		مقام: لال حویلی
روز پنجشنبہ بعد مغرب		حیدرآباد دکن

خالہ بی الجھ کر بولیں :۔ "اے بی ڈھنگ سے پڑھو ذرا۔ کیا سُنا رہی ہو یہ؟
بلقیس دلہن کو غصہ آگیا۔ "لو بھلا میں ایسی نپٹ جاہل ہوگئی کہ شادی کا رقعہ بھی پڑھنا نہ آئے۔ پھوپھا میاں کی دو ہی تو بیٹیاں ہیں نا اماں بی، ایک بڑی بھابی اور ایک بانو۔ اب بھلا وہ اور کس کی شادی کا رقعہ چھپوا سکتے تھے؟ اور پھر لال حویلی میں کون رہتا ہے"
"مگر لڑکا کون ہے؟ کیا پتہ ہمارا چھوٹے میاں ہی نہ ہو۔"
"اے واہ!"، منجلی دلہن کو ایسے بے موقع ہنسی آئی کہ خالہ بی کی تیوری چڑھ گئی، مگر وہ ہنستے ہنستے ہی بولیں :۔
"ہمارے دیور جی کی بات ہوتی تو کھلا کھلا نام ہی نہ چھپوا دیتے۔ یہاں تو جان بوجھ کر دونوں کے نام چھپائے گئے ہیں کہ کوئی بیچ میں ہاتھ نہ مار دے۔"
موہانی جان غصے میں بولیں : "لو اور سُنو، بھلا کہیں شریف لڑکیوں کے نام یوں رقعوں میں چھپا کرتے ہیں؟ ہزاروں غیر مردوں کی نگاہ نام پر پڑے تو کیا شرافت رہ گئی!"
منجلی دلہن تیکھے پن سے بولیں :۔ بھلا نہ سہی دولہن کا نام، دولہے کا نام تو لکھوا سکتے تھے نا!
اوپر سے چھوٹے میاں کوٹ پتلون ڈالے، ہاتھوں سے بال برابر کرتے برآمد ہوئے تو دیکھا پوری پنچایت موجود ہے اور معاملہ خاصہ اہم معلوم ہوتا ہے۔ سارا معاملہ سمجھ میں آگیا۔ ڈھٹائی سے بولے :۔ ہاں ہاں بانو بہن کی نسبت ہمی نے لگائی ہے۔"
سسرال میں بانو کی لاج کھلوائی بھی ہوتی۔ ساس مردسے بول چال بھی شروع ہوگئی مگر

ادھر اتنے دن گزرنے پر بھی خالہ بی کے رویے میں کوئی فرق نہ پڑا۔ ان کا جی تو ہر لمحہ یہی چاہا کرتا کہ بس چلے تو اپنے ہاتھوں اس کلموہے کا گلا گھونٹ دیں۔ مگر پھر سوچتیں کہ کیسے درد وں سے پیٹ پھاڑ کر جنا تھا تو ہاتھ مل کر رہ جاتیں۔ بھابیاں تو خالہ بی سے صاف کہتی تھیں :۔

"کسی ایسی ویسی کو گلے باندھ لیا ہے"

اب خالہ بی کا یہ حال کہ جو بھی کہے سن لیں اور منہ نہ ہلائیں۔ مگر غصے کے اظہار کا یہ طریقہ انھیں خود ہی نہ بھایا اور اب یہ چلن اٹھایا کہ آتے جاتے چھوٹے میاں کو تیز تیز نظروں سے دیکھا کرتیں۔ بہوؤں کی منڈلی میں بیٹھ کر ایک دن کہا بھی :۔

"میرے جیتے جی کون حرام زادی ہے، ذرا اس گھر میں قدم دھر کر تو دیکھے"

کہاں تو چھوٹے میاں شہزادے باجتے تھے کہ شہزادی بدر کمال کو بیاہنا پڑا تھا یا اب یہ حال کہ اللہ جانے کس سڑی ماری کو گلے کا تعویز بنا رکھا تھا کہ نکالتے نہ بنتا۔

بات اب تک بھی ڈھکی چھپی تھی، کسی کو معلوم نہ تھا کہ اصل بھید کیا ہے۔ خالہ بی کے دل کو یہی آس تھی کہ بات کچھ بڑی نہیں، کوئی رکھی رکھیلی ہے نہ رانڈ رنڈی، بس چپ ہی بچھڑا بنا گھوم رہا ہے۔ چار دن گھومے گا پھرے گا تو آپ ہی آپ رستوں پر آجائے گا۔ اور ایک آدھ دن کسی بھاوج کا پلو پکڑ کر کہے گا :۔

"بھابی ماں اب ہماری بھی کرا دو نا"

بیٹی غریب کی ماں کا تو یہ حشر ہوتا ہی ہے کہ ہر آیا گیا پوچھ پوچھ کر ناک میں دم کر دیتا ہے، "کیوں بیٹھی ہے؟ کیوں بیٹھی ہے۔؟" مگر کھاتا کماتا جان جوان بیٹا بھی اگر یوں ہی ڈھکلیاں کھاتا دکھائی دے تو ماں کی جان ضیق ہو جاتی ہے۔ خاندان میں لڑکیوں کی مائیں بھی تو تھیں ہی۔ اپنی اپنی بیٹیوں کی سب ہی ماؤں کو فکر ہوتی ہے۔ ٹوہ کیسے نہ لیں؟ کبھی کبھار خالہ بی کا جی چاہتا اکتا کر بول ہی دیں :۔

"شادی کے قابل ہی نہیں تو موا کیا کرے شادی"

اتنے پر بھی خالہ بی تہیہ کئے بیٹھی تھیں کہ ڈھنگ کی لڑکی دکھائی دی تو بس حضرت کو کس ہی دوں گی۔ مگر حضرت تو ایسے تڑبھڑے تھے کہ پٹھے پر ہاتھ نہ دھرنے دیتے۔

گرمیوں کی چاندنی راتوں میں جب شام ڈھلتی اور رات اٹھتی تو سارا آنگن مہندی کی کچی کلیوں اور موگرے، موتیا کی کھلی، ادھ کھلی کلیوں اور پھولوں سے مہک مہک اٹھتا۔ سارے بچے جمع ہوتے اور کھیل کود مچتا۔ چھوٹے میاں تھے تو چوبیس پچیس کے، مگر بھتیجیوں، بھتیجوں سے مل جل کر

بس بچے ہی رہ جاتے۔ اس رات خالہ بی سفید چاندنی بچھے تخت پر چھالیہ کترتی بیٹھی تھیں۔ بہوئیں ادھر اُدھر پلنگوں پر ہنسی دل لگی کی باتیں کرتی پڑی تھیں۔ بچے سارے میں شور مچا رہے تھے کہ ادھر سے چھوٹے میاں نکل آئے۔

ساروں نے چھوٹے میاں کو جالیا۔

"چچا میاں کہانی، چچا میاں کہانی۔"

"ارررے" وہ کوٹ کا دامن جھاڑتے ہوئے بولے۔ "یہ کوئی وقت ہے کہانی سُننے اور سُنانے کا؟ پھر کبھی۔"

"اے لو! اور کون وقت ہوتا ہے کہانی کا؟" منجلی بھابی تنک کر بولیں۔ "پھر کیا صبح سویرے کہانی سنایا کرتے ہیں؟ چھ ہاتھ کے چچا بنے ہو، کبھی تو بچوں کی بات مان جایا کرو۔"

"اچھا، اچھا" وہ ہنستے ہوئے وہیں جم گئے۔ "یوں خفا کیوں ہو رہی ہو آپ؟ تو بھئی بچو! ایک تھا بڑا خوبصورت شہزادہ اور ایک تھا وزیر زادہ۔ دونوں کا دل ہی نہ لگتا تھا بس جناب شہزادے نے پالا ایک طوطا اور وزیر زادے نے پالی ایک مینا۔ بڑی خوبصورت سی کہ بس دیکھے ہی جاؤ۔"

"میرے جیسی چچا میاں؟" صالحہ نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔ سارے بچے کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ چھوٹے میاں بھی ہنستے ہنستے سارے چہروں پر نظریں دوڑانے لگے، گویا دیکھتے ہوں مینا کس جیسی تھی۔

"بڑی پیاری سی تھی بھئی وہ۔ منی سی۔ گڑیا سی۔ بس جیسے اپنی کاکل......"

جانے کون سی رو میں چھوٹے میاں کیا کہہ گئے کہ ایک دم سے سٹ پٹا گئے۔ اور ادھر پوری فضا میں بم گر جانے کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ بھابیاں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگیں اور خالہ بی کے ہاتھ کا سروتہ یوں ہی ٹنگا کا ٹنگا رہ گیا۔ اتنے سارے بچوں میں ایک کا بھی نام کاکل نہ تھا۔ اور کیسا انوکھا سا نام تھا؟ بھئی نام ہوا کرتے ہیں رابعہ، کلثوم، صالحہ، مریم، شاکرہ، زہرہ، سلیمہ، یہ کون ٹک ہے کاکل ۔۔؟

خالہ بی کو اپنا ماں ہونا یاد آیا اور دوسرے ہی لمحے وہ ایک تناکے کے ساتھ اُٹھیں اور عین چھوٹے میاں کے سر پہ پہنچ کر ان کے بال ہاتھوں میں کھسوٹ ڈالے۔

"بول یہ کاکل کون ہے تیری ہوتی سوتی؟"

چھوٹے میاں کے منہ پر رنگ سا چھا گیا، بڑی مضبوط آواز میں بولے :۔

"میں نے دو سال ہوئے شادی کرلی ہے اماں ۔ اور کاکل آپ کی پوتی ہے اور میری بیٹی"۔

چھوٹے میاں اگر جھوٹ بولتے یا بہانہ تراشتے تو خالہ بی کے غصے کو راہ مل جاتی، مگر انھوں نے اتنا بڑا ۔ بے باک سچ کہہ دیا کہ خالہ بی کے ہاتھ ہی ڈھیلے پڑ گئے ۔

"شادی کرلی ؟"، وہ مرے مرے لہجے میں بولیں، "مگر کس سے ؟"

"میرے ماتحت ایک کلرک ہیں، ان کی بیٹی ہے اماں ۔ بہت غریب لوگ ہیں اماں، بڑی اچھی لڑکی ہے ۔ آپ بھی ..... ؟

خالہ بی کا رکا ہوا غصہ پھر بھڑک اٹھا :۔ "ہاں ہاں غریب ہے ۔ مگر بہت اچھی ہے۔ سو چھنالوں کی ایک چھنال ہوگی ۔ ورنہ یوں بغیر گاجے باجے کے بچہ نہ جن لیتی "۔

چھوٹے میاں کا منہ تپ گیا ۔ سامنے ہی بھتیجے بھتیجیاں کھڑی تھیں ۔ آنسو ان کی آنکھوں میں ڈگڈگانے لگے ۔ بڑا دل کرکے بولے :۔

"قسم خدا کی اماں آپ نے مجھے جنا ہے اور آپ کا اس سے بھی بڑھ کر حق لگتا ہے کہ جو چاہیں کریں، جو چاہیں کہیں "۔

گھر کی بہتی گاتی فضا میں ایک رُکا رکا پن آگیا ۔ بچے قصور کرتے ہیں تو ماں باپ معاف کر ہی دیتے ہیں مگر قصور بھی قصور جیسا ہو ! یہ نہیں کہ زندگی جیسی زندگی کا ساتھ، اور ہاتھ پکڑ لیا ایک کلرک زادی کا ! جس کے خاندان کا پتہ نہ بُرے بھلے کی خبر ۔ خالہ بی کا غصہ بجا تھا ۔ بھابیاں منہ دے کر بات نہ کرتیں، بھائی کھنچے کھنچے رہتے ۔ اتنے بڑے کنبے میں رہتے سہتے بھی چھوٹے میاں خود کو اکیلا اکیلا محسوس کرتے

برسات کے دن لگے، بدلیاں چھاتیں، برس جاتیں، کبھی چھاتیں اور ہوا کے زور سے بکھر بھی جاتیں ۔ موسم بدلا تو سب کی طبیعتیں بھی بگڑنے لگیں ۔ بچوں پر زیادہ زور پڑا ۔ ناکیں سُر سُرانے لگیں ٹھوں ٹھوں کھانسنے لگے، آنکھوں سے پانی بہنے لگا ۔

خالہ بی کی اپنی ایک چھوٹی سی الماری تھی، اس میں ہاتھ کی بنائی ہوئی، گھر کی تیار کردہ دوائیں رہتیں ۔ کھانسی زکام سے لے کر ہیضے بخار اور پھوڑا پھنسی تک بھی بیماریوں کی دوائیں ۔ بڑے تایا طب کرتے تھے اور ان کے نسخے خاندان بھر میں چلتے تھے ۔ ہاسپٹل کی دوا سے تو خالہ بی کا پرانا بیر تھا ۔ موا گھڑوں پانی ملا دیتے ہیں، کیا فائدہ کرے گی ؟، کوئی مارے ترقی پسندی کے دوا خانے کی لال پیلی دوا لے بھی آتا تو موری میں سے بو اُٹھتی دیکھ کر جان جاتے کہ خالہ بی نے بہادی ہوگی ۔

پچھلے چار پانچ دنوں سے چھوٹے میاں اپنے آپ میں نہ تھے۔ کھوئے کھوئے سے، بجھے بجھے سے، آنکھیں سرخ اور جاگی جاگی سی، بال اُلجھے بکھرے۔ عجب ہونقوں کی سی صورت بنائے پھرتے تھے۔ کسی سے بول نہ چال، بس اپنے کمرے میں پڑے ہیں۔ صبح ہوئی باہر گئے۔ دوپہر کا کھانا کھانے آئے پھر شام کو پانچ بجے کی بجائے رات کے گیارہ بارہ اور کبھی تو دو بجے کی خبر لاتے۔ زندگی کا معمول عجب بدلا بدلا سا ہو گیا۔

صالحہ کی کھانسی نے زور پکڑا تو دادی کو ہول ہو گئی۔ چنگی پڑیا تو جاری ہی تھی، بوا کریمن نے ڈرا دیا۔ "اسے بی کالی کھانسی ہے۔ بھلے کو شروع میں علاج کرا لو ورنہ جو پڑ جیب گر گئی تو۔ بٹیا عمر بھر کو گنگانی ہو جائیں گی۔"

رات کے گیارہ بارہ کا وقت تھا، خالہ بی نیند بھری آنکھوں سے اُٹھ کر الماری والے کمرے کو چلیں۔ ابھی دروازے ہی میں تھیں کہ ملگجے اُجالے میں دیکھتی ہیں کہ اُن کے اپنے کمرے سے چھوٹے میاں شیشی پکڑے نکل رہے ہیں۔ ماں کو آتا دیکھا تو بوکھلا سے گئے اور شیشی ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ ماں نے بیٹے کو گھور کر دیکھا۔ آنکھوں کی سرخی کا تعلق دل کے درد سے ہوتا ہے، چھوٹے میاں کی آنکھ سرخ تھی دل نے درد ضرور دکھایا ہوگا۔ اماں نے پھن پھنا کر فرش کو دیکھا۔ سارے میں کالی کھانسی کی گولیاں بکھری ہوئی تھیں۔ کلپ کر کوسا دیا:۔

"جیسے گھورے پر پیدا ہوئی ہے، ایسے مر بھی جائے۔ ہونہہ! — علاج ہو رہے ہیں لاڈلی کے۔ ہمارے خاندان میں ٹیک لگا دی کمبختوں نے۔"

سورج اور چاند کسی کی راہ نہیں دیکھتے۔ چڑھتے اُترتے رہتے ہیں۔ دن تو گزرتے ہی ہیں اور گزرتے ہی رہے۔ ماں بیٹے کے بیچ خفگی اور غصے کی جو دیوار کھڑی تھی وہ جوں کی توں ہی رہی۔

سرما کے دنوں میں پھلوں کا خوب موسم ہوتا ہے۔ خالہ بی نے ڈھیر سی سرخ سرخ گاجریں خریدیں، ان کے بن کش کیے، ساس بہوؤں نے مل جل کر دیگچہ چڑھایا۔ گھر کی بھینسیں تھیں، گھوا خوب تھا۔ سیر ڈیڑھ سیر کھویا بھی اس میں لنڈھا دیا۔ وہ مزے کا حلوہ بنا کہ چار گھر دور تک خوشبو اُڑ اُڑ گئی۔ دستر خوان بچھا، سبھی بیٹھے۔ نوکر چھوٹے میاں کو بھی بلانے گیا، مگر وہ اپنے کام میں اُلجھے ہوئے تھے، بولے:۔

"میرا کھانا یہیں پہنچا جا۔"

جب سے اُنھوں نے خالہ بی کی چھاتی پر سل رکھ دی تھی یہ ان کے بُرے بھلے میں نہ بولتی تھیں۔ جیسا کہتے تھے، کر دیتیں۔

"مروکہ جیو۔ ہمیں کیا لینا ہے ؟" اور اِدھر چھوٹے میاں تھے کہ مچھلی کا کانٹا ہو کر رہ گئے تھے کہ مچھلی کا انگ ہوتا ہے مگر کوئی منہ نہیں لگاتا۔

نوکر نے کھانے کا طشت ان کے کمرے میں پہنچا دیا۔ ابھی سرپوش اُٹھایا بھی نہ تھا کہ الائچی اور گھی کی خوشبو سارے میں پھیل گئی اور ناک سے ہوتی دل میں اُتر گئی۔ سرپوش اُٹھا کر دیکھا :۔ گہرے سرخ رنگ کا حلوہ، چاندی کے ورق لگے ہوئے۔ ابھی چھوٹے میاں نے ایک چمچہ اُٹھا کر منہ میں رکھا ہی تھا کہ کوئی حلق میں آکر اٹک گیا۔ ہاتھ یوں ہی چھوڑ دیا۔ اِدھر اُدھر دیکھا، باہر سب کھانے میں مگن تھے۔ برتنوں، چمچوں اور رکابیوں کی کھڑ دھڑ ہو رہی تھی۔ جلدی سے اُٹھے، اخبار میں سے ایک بڑا سا کاغذ نکالا اور پلیٹ اُٹھا کر اس میں لپیٹ لی۔ جیب سے دستی نکال کر پوٹلی سی بنا لی اور الماری میں رکھ خود طشت کے پاس کھڑے کھڑے اُلٹے سیدھے نوالے ٹھونسنے لگے۔

خالہ بی عشار کی نماز پڑھ کر لیٹی تھیں۔ ابھی ابھی گھر بھر کے چراغوں کی لو نیچی کر کے گئی تھیں اور سارے میں ملگجا ملگجا سا اُجالا پھیلا ہوا تھا۔ سب اپنے اپنے بستروں پر پہنچ گئے تھے۔ چھوٹے میاں نے اِدھر دروازے میں سے جھانکا، سامنے دیوار پر اُن کے سر کا سایہ اُبھرا اور پھر اندر ہو گیا۔ خالہ بی کی بند ہوتی آنکھیں کھل گئیں۔ پھر دھیرے سے چھوٹے میاں نے پوٹلی اُٹھائی اور کمرے سے باہر ہو کر پٹ اندر بھیڑ دیئے۔ چپکے چپکے قدم اُٹھا رہے تھے کہ پیچھے سے کسی نے ایسا ڈپٹا دیا کہ پوٹلی دھپ سے نیچے جا گری اور اسی دم تین چار ٹکڑوں میں ٹوٹ ٹوٹ گئی۔ انھوں نے پیٹھ موڑ کر پیچھے دیکھا، خالہ بی کانپتی کھڑی تھیں۔ گرجدار آواز سے بولیں :۔

"اے ہے! پیاروں پیٹے حلق میں اٹک جاتے ہیں نا۔ خبردار! جو دانہ بھی باہر نکالا۔ حضرت کے نام سے فاتحہ دلوائی تھی تو ایسے حرام خوروں کے لئے نہیں۔"

چھوٹے میاں نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولنا چاہا، مگر وہ پیر بختی اپنے بستر تک پہنچ چکی تھیں۔

چھوٹے میاں کے جی کو جیسے روگ لگ گیا۔ ہونٹوں کی ہنسی جیسے کسی نے چرا لی۔ کہاں تو وہ ہونٹ کہ سدا پھولوں کی طرح کھلے رہتے یا اب یہ حال کہ آنکھوں میں شبنم سی گھلی رہنے لگی۔

بڑے بھائی جان تھے، پھر اختر بھائی، اچھے بھیا، عزیز بھائی، ذاکر بھائی، پھر چھوٹے بھیا کہ گھر بھر میں ان کے اور ان کی بیویوں بچوں کے قہقہے اچھلتے رہتے۔ اماں کو ہر بات کا چاؤ چونچلا۔ کوئی دن نہ گزرتا کہ کسی کی سالگرہ نہ ہوتی ہو۔ کسی کا عقیقہ ہے تو کسی کی چھٹی۔ کسی کا بوٹن ہے تو کسی کی دودھ بڑھائی۔ بھابیاں ایک سے ایک رنگا رنگی کپڑے پہنتیں۔ زیور سے سجی بنی، ہنستی بولتی گھومتی ہیں اور بھائی ہیں

کر کھلے خزانے دھڑسے دروازے بند کرتے ہیں۔ دلہنوں کے ساتھ راتیں گزارتے ہیں اور علی الاعلان حمام تیار کرواتے ہیں۔ ایک چھوٹے میاں تھے کہ چوٹوں کی طرح راتیں سجاتے۔

کاکل سال بھر کی ہونے کو آئی تو باپ کو چونچلا سوجھا۔ سال پورا ہونے میں تین دن رہ گئے تھے۔ پاس میں کیا رکھا تھا؟ ٹرننگ وریننگ گئی سب چولہے بھاڑ میں، دل پر ایسا پتھر آ پڑا تھا کہ کسی بات میں نہ رہے۔ کوئی بات ڈھنگ سے نہ کر پاتے۔ باپ تھے کہ ماں کے کہے میں۔ اور جب ماں نے ہی ہر طرح سے پابندی لگا دی تو کیا چھوٹا ڈھیلا بھی ہاتھ پڑتا ہاں بس انگلی میں زمانے سونے کی نو ماشہ کی انگوٹھی پہنے رہتے ہیں، سوطے کر لیا ہے کہ رانی بٹیا کی سالگرہ اسی سے رچائیں گے۔

دل امیروں کا بھی ہوتا ہے اور غریبوں کا بھی۔ ارمان تو سبھی کو لگے ہوئے ہیں!

دکانوں دکان گھومتے رہے۔ موتیوں کا ہار، سستی قیمت کا ریشم کا سلا سلایا فراک، ننھے مُنّے سرخ جوتے اور چاکلیٹ کا ایک ڈبہ، بطور تحفہ کافور کی گڑیا، سارا سامان الماری میں ڈرپ کر کسی کام سے باہر گئے ہوئے تھے کہ بچوں میں سے کسی کی نظر پڑ گئی کہ چچا میاں کی الماری میں تو رنگ برنگی دوکان سجی ہے۔ تمام گھر وائے میں بوم ہو گئی کہ لو بھئی اب تو ایسے ڈھیٹ ہو گئے ہیں کہ دن کی روشنی میں اپنی رکھیلی کے لاڈلوں کو سجانے کے جتن کرتے پھرتے ہیں۔

ایک منہ سے نکلی اور دوسرے منہ تک پہنچی۔ گھر تھا کیا سوا اچھا خاصا چھلنی تھا کہ ادھر بات پڑی نہیں کہ ادھر ٹپک پڑی۔ خالہ بی دراتی ہوئی کمرے میں پہنچیں۔ بڑے سلیقے سے خریدا گیا تھا سارا سامان ــــــ ننھا منا سا سرخ فراک، چھوٹے چھوٹے لال لال جوتے، مالا، چاکلیٹ کا چمچماتا ڈبہ۔ ایک پیٹھے کے ڈبے پر ایک چٹھی لگی ہوئی تھی۔

"یہ کیا لکھا ہوا ہے رے؟" انھوں نے ڈپٹ کر نسیم میاں سے پوچھا۔

"جی .... جی دادی اماں ابھی پڑھتا ہوں" وہ اٹک اٹک کر سنانے لگے "ننھی گڑیا کی سالگرہ پر ــــــ ارمان بھری پہلی سالگرہ پر۔ اس کے باپ کی طرف سے"

خالہ بی نے سارے سامان پر نظر کی اور جلتے گھی میں ٹھنڈے پانی کے چھینٹے ایسے پڑ گئے۔

"لو اور سنو اچھی نہ چلّے ہوئے حرامی پلّے۔ ہماری نقل میں سالگرہیں پڑتی ہیں۔" اور خالہ بی نے ایک لات جوتوں کو ماری، ایک ہاتھ سے فراک کھسوٹا۔ مالا اور چاکلیٹ کا ڈبہ زمیں پر رلنے لگے اور رہی سہی ہاتھ کی صفائی ڈبے پر ہو گئی۔ ڈبہ دور جا گرا اور اس میں سے بڑی سی کافور کی گڑیا نکل کر دو گڑیاؤں میں بٹ گئی۔

آنسو بزدلی کی نشانی ہیں اور غصہ بغاوت کی۔ مگر اس دن تو چھوٹے میاں کی آنکھ بھی نم ہوئی اور غصہ بھی بے بھاؤ آیا۔ یوں دکھانے کو تو ہاتھ بھر لمبی ناک دکھا دیتے مگر گھر دار الگ ماندنے کی سوچتے تو اتنا کس بل کہاں تھا؟ ابھی نہ کمائی کا کوئی ٹھور ٹھکان تھا نہ اور کوئی دوسری آمدنی۔ ورنہ جی تو یہی چاہا کہ اک دم سے گھر چھوڑ کر چل ہی دیں۔ سالگرہ کی کیسی مٹی پلید ہوئی؟ خود پر ہی غصہ آیا کہ جلدی میں سب سامان کھلا چھوڑ کر چلتا بنا، ورنہ کسی کے فرشتوں کے بھی پتہ نہ لگتا۔ گڑیا کے ٹکڑے دیکھ کر رات بھر دل میں رہ رہ کر ٹیسیں اٹھتی رہیں۔ "اب اس گھر میں نہ رہوں گا" انھوں نے دل ہی دل میں طے کر لیا۔

جس دن کاکل بیٹا کی سالگرہ پڑتی تھی باپ اپنے کمرے میں منہ لپیٹے چپکو بکو ر دیکے جاتے تھے۔!

مردوں کا اِدھر اُدھر نگاہیں جھکانا عام سی بات ہے۔ اور کنواروں کا کیا ذکر ہے۔ اچھے گھر بھر کے بچے ہیں، بیوی کا ہے۔ ایسوں کو بھی کبھی باہر کی چاٹ لگی تو کوٹھا جا بسایا۔ اس میں حیرت کی بات ہے نہ غصہ کی۔ مرد کی ذات ہوتی ہی ایسی ہے۔ خود خالو میاں کا حال کیا ڈھکا چھپا ہے۔ نوٹنکی کے بہانے سال چھ مہینے دو چار دفعہ باہر کی ہوا کھاتے ہی تھے اور دوسری ہی نوٹنکی دیکھ کر لوٹتے تھے۔ مگر ایسا بھلا کہاں ہوتا ہے کہ ایسی ویسی عورتوں کو سر ہی چڑھا لیا جائے۔؟ دل آجانا بھی بری بات نہیں۔ اللہ نے آنکھ دیکھنے کو دی ہے اور اگر چلتے پھرتے کوئی چاند سی صورت آنکھ میں بھر گئی تو کیا ہوا؟ مگر یہ تو بری بات ہوئی کہ اس کو گھر کی رانی ہی بنا ڈالیں!

بھلے سبھاؤ میں ایک دن منجلی بہو نے ساس کو رائے دی بھی۔ یہی کہ چھوٹے بھیا کو معافی دیدیں مگر خالہ بی کا بھی وہ حال تھا کہ چولہا تو مدت ہوئی بجھ چکا تھا، مگر تپش ابھی تک باقی ہی تھی۔ ذاکر میاں کی بیوی کا کہنا تھا کہ ضرور چھوٹے میاں کی بیوی اچھے گھر اور اچھے عادتوں کی ہے، تب ہی تو وہ اب تک اس سے لگے ہوئے ہیں۔ ورنہ مرد لوگ تو جہاں کوئی کھوٹ خرابی دیکھتے ہیں۔ بس جی چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ اور لگتا ہے دل کی بھی بری نہیں۔ انھوں نے پچھلے دنوں کا واقعہ یاد دلایا کہ سردی کا زور ہوا تو چھوٹے میاں بڑے بھائی جان، اچھے بھیا اور عزیز بھائی کے گود کے بچوں کے لئے ہلکے نیلے رنگ کے اون کے بُنے ہوئے چھوٹے چھوٹے موزے اور ویسی ہی ٹوپیاں لائے تھے۔ بھابیوں نے پوچھا بھی:۔

"کہاں سے لائے میاں؟ کیا قیمت ہے؟"

تو ذرا مسکرا کر بولے:۔ "میرے دوست کی دکان ہے۔ وہاں سے لے آیا ہوں" بھلا کون دوست ایسا جی والا تھا کہ گھر بیٹھے بھکٹ میں اپنا نقصان کرواتا؟ اور منجلی بھائی نے جو بنوٹ دیکھی

تو صاف پہچان لی کہ گھر کی ہی بنائی ہے۔ اب ظاہر ہے یہ اسی کا کام ہو سکتا ہے، ورنہ اور کس کا پھیپھڑا اُچھلے گا۔؟

مگر وہ تو خالہ بی تھیں اپنے نام کی۔ مرتی مر جاتی مگر کبھی یہ رسوائی نہ کرتیں کہ غیروں کی بیٹی ان کی بہو کہلائے۔ اور غیر بھی کیسی کہ جس کے خاندان کا اتہ پتہ نہ ذات پات کی خیر خبر۔ کیا غیروں کی بیٹیاں نہیں اُٹھایا کرتے؟ مگر وہ بھی ذرا تمیز سے، دیکھ بھال کے۔ ایسے نہیں کہ بس راہ چلتی کو دیکھا اور آنکھوں کا کاجل بنا لیا۔

اس دن تو خالہ بی کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ گھر بھر میں بچے اودھم مچا رہے تھے اور تمام مائیں بیٹھی خوش ہو رہی تھیں۔ بیٹے اپنے اپنے کمروں میں تھے۔ باہر بھی نکل آتے کام سے، پھر اندر چلے جاتے کیسی چہل پہل تھی! ہلکی ہلکی بوندیں برس رہی تھیں، بڑا سہانا سہانا سماں تھا۔ اور تو سب تھے، بس چھوٹے میاں ہی وہاں نہ تھے۔

خالو میاں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر رک رُک کر بولے:۔

"اجی میں کہتا ہوں بچے غلطیاں کرتے ہی ہیں۔"

خالہ بی سمجھیں ان کھیلتے بچوں میں سے کسی نے شرارت کی ہوگی، اس پر کہہ رہے ہوں گے۔ بولیں:

"ہاں اور بچے کرتے بھی کیا ہیں؟"

باپ خوش ہو گئے۔ سمجھے بات بن گئی۔ بولے:۔ "وہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں کہ اب ہوا سو ہوا۔ جوان بچہ ہے، جان پر کھیل گیا تو کیا کر لیں گے؟ آنے دو گھر میں چھوٹی بہو کو بھی؟"

خالہ بی نے تڑک کر ان کی طرف دیکھا۔

"اے لو بیٹے کی پشت پناہی ہو رہی ہے، ہوتا ہوگا تمہارے بڑوں میں کہ چلتیوں کو گھر ڈال لیں، میرے ہاں ایسا ہوا تھا نہ ہوگا۔ میں بھی سمجھی کیا کہنے جا رہے ہیں۔ اچھا ہوا جو میرے سامنے کہتے ہو تو ـــــ سامنے قبلہ ہے، ہاں سچ کہتی ہوں باؤلی میں چھلانگ لگا دیتی۔ غضب خدا کا ذرا دیکھو تو کیا دن آیا ہے کہ دیدوں کے سامنے ایسی واہیات حرکتیں ہوں اور ہم مان بھی جائیں۔ سچ سناتی ہوں کہ کتے کو ساتھ بٹھا کر کھلاؤں پر اُس حرافہ کو اپنے در پر نہ پھٹکنے دوں کہ میری کوکھ کی بدنامی سمیٹ رہی ہے۔"

خالو میاں چپ رہ گئے۔ حیل حجت زیادہ کرتے بھی نہ تھے۔ وہ خود بڑے سخت قسم کے آدمی تھے۔ پر روایتی بادشاہوں کی طرح انھیں بھی ساتواں شہزادہ بے حد عزیز تھا۔ بچپن میں بڑے بچوں کو مارا ہو تو مارا ہو، چھوٹے میاں کو تو کبھی دھکا بھی نہ دیا۔ کیسی ہی ضد کیوں نہ کرتے پوری کر دیتے۔ اِدھر

ماں بگڑتی ہی تھیں کہ چھوکرے کو دو کوڑی کا کردو گے، مگر ان سے سہار کہاں ہوتی کہ چیز سامنے دھری رہے اور بیٹا بلکتا رہے۔

اب بھی ان سے کہاں سہار ہو رہی تھی؟ بیوی تھی کہ چار گھر پرے ہی تھی اور بیٹا تھا کہ خالی پہلو سوتا تھا اور مرد ہوتے بھی عورتوں کی طرح بلکتا تھا۔ مگر زیادہ زور دیا بھی نہیں۔ جانتے تھے خالہ بی سدا کی ہیکڑی ہیں، بات غصّے کی ہو یا مذاق کی، جو کہتیں پورا کر دکھاتیں۔

رمضان کی عید آئی اور اسی زور شور سے آئی، جیسے کہ سدا آتی تھی۔ گھر بھر میں وہی چہل پہل مچ گئی۔ بچے اپنے کپڑے لے لے کر بھاگ رہے ہیں۔ مائیں ڈانٹ رہی ہیں۔ ادھر خالہ بی کی نوکروں پر پڑتال پڑ رہی ہے کہ نمازی عیدگاہ جانے کو تیار بھی ہو گئے تو کسی کام کا ٹھکانا ہی نہیں۔ ادھر لڑکیاں ہاتھوں کی مہندی چھڑا رہی تھیں تو بیٹے نہا نہا کر نکل رہے تھے اور رول مچا رہے تھے۔ کوئی کمربند نہ ہونے کی شکایت کر رہا تھا تو کسی کو اپنا جوتا ہی نہ ملتا تھا۔ کسی نے اپنی اچکن کے بٹن نیچے اوپر اٹکا لئے تو کسی کا ازار بند ٹخنوں تک لٹک رہا ہے اور اسے کھوسنے تک کی بھی سدھ نہیں۔

اتنے ہنگاموں میں ایک چھوٹے میاں بھی تھے کہ خاموش سکتے۔ اُٹھے، چپ چاپ غسل کیا صاف کپڑے بدلے اور نماز گاہ کو چل دیئے۔ ماں بیٹے کا مدت سے ابولا بندھا تھا۔ نہ یہ ان سے بات کرتی تھیں نہ وہ خود ہی رُخ دیتے تھے۔ عید کے دن تو بڑے دشمن بھی گلے مل لیتے ہیں، یہ تو اپنے پیٹ کی اولاد تھا۔ مگر چھوٹے میاں نے آکر سلام کیا تو خالہ بی نے منہ پھیر لیا۔ گلے لگاتیں تو دعا دینی ہی پڑتی۔

"خدا بڑی عمر کرے سہرے کے پھول کھلیں۔"

مگر سہرے کے پھول تو آگے ہی کھل چکے تھے اور کس کے نام سے؟ غصہ کی ایک لہر اُٹھی اور ان کے پورے جسم میں دوڑ گئی۔ چور نگاہوں سے بیٹے نے ماں کو دیکھا۔ غصے میں دھاں پھوں، دھاں پھوں کر رہی تھیں۔ چپکے سے اپنے کمرے میں جا پڑے۔

خالہ بی کھلانے پلانے کے انتظام میں لگ گئیں۔ سب ہی لوگ عیدگاہ سے واپس آچکے تھے سات بیٹوں کی ماں، چھ بہوؤں کی ساس، ڈھیر سارے پوتوں پوتیوں کی دادی کہ سلام دعا لیتے دیتے ہی گیارہ بج گئے۔ مردوں کی عیدگاہ سے واپسی پر عورتوں کی عید مچتی ہے۔ زمانے میں دھوم مچ گئی ساس پیڑھی پر بیٹھ نگاہ و دل کو ٹھنڈک پہنچانے لگیں۔

بڑی دلہن نکلیں: ہری بنارسی ساڑی، جھکا جھول زیور، سنگھار پٹار کیے، مسکراتی ہنستی، کن انکھیوں سے میاں کو دیکھتی ہوئیں، ادھر سے منجلی دلہن آئیں: کھڑا کمخواب کا پائجامہ، بنارسی چولی

کرتی، تاش کا دوپٹہ، گہنے پاتے سے سجی بنی۔ عزیز میاں، ذاکر میاں، اکرم میاں کی دلہنیں ایک دوسرے سے چھیڑ کرتیں، ہنستی مسکراتی صورتیں۔ پھر بلقیس آئیں: چھیوں بہوؤں میں یہ سب سے زیادہ پیاری تھیں۔ سرخ کامدار تولواں ساڑی پہنے۔ چھ مہینے کا پیٹ اونچا اونچا ابھرا ہوا، مسی کی دھڑی اور مانگ میں افشاں۔ ایسے بھاری زیور کپڑے اور پہننے والی ایسی نازک پھول پان! چلنا دوبھر ہو رہا تھا۔ بچّے رنگین کپڑوں میں ملبوس، منہ میں پان ٹھونسے تھوکتے پھر رہے تھے۔ کبھی باہر تو کبھی اندر، ابھی یہاں کہ ابھی وہاں۔ مردانے میں ملنے والے آئے اور بادل نخواستہ مرے مرے قدموں سے چھوٹے میاں بھی عید ملنے، مصافحہ کرنے گئے۔

اک دم اندر سے بچوں کا شور اُٹھا اور ہاتھوں میں ایک بنڈل سا پکڑے لے کے آئے۔ آٹھ بارہ آنے گز میں ملنے والے سُرخ ریشم کی ساڑی اور ایسی ہلکی قسم کی کہ پہننے والی ذرا بھاری کو لیے کی ہوئی تو ایک ہی دھوپ میں بکس بکس جائے، اور ایک سُرخ ہی رنگ کا بھاری سافراک، جس پر جگہ جگہ گوٹہ کے ٹنکے ہوئے تھے، چھوٹے چھوٹے۔ یہ ایک مجبور شوہر اور ارمان بھرے باپ کا آنسو بھرا تحفہ تھا۔ صبح یوں ہی خالہ بی ساروں کے کمروں میں اگربتیاں سلگاتی پھر رہی تھیں کہ اُنھیں سرخ پلو جھانکتا ہوا دکھائی دے گیا تو اُنھوں نے کہاں سوچا تھا کہ یہ عید کی سجاوٹ بناوٹ ہے۔ وہ بڑے غور سے ساڑی کو دیکھنے لگیں۔ ان کی نظر کے سامنے سے بڑی دلہن گزریں۔ جن کی بنارسی ساڑی چم چم چمک رہی تھی۔ سو دو سو سے کم کی کیا ہوگی؛ پھر منجلی دلہن کی کہ کمخواب کا پاجامہ ہی سو ڈیڑھ سو کا ہوگا، کرتی، چولی، دوپٹہ تو الگ رہا۔ پھر چھوٹی ہوئیں، جن کے کپڑے ایسے بھاری، کامدار، تولواں کہ چلنے میں لپک لپک جاتی تھیں۔ اور یہ ساتویں شہزادی کیا پہن رہی ہے آج ؟ — خالہ بی کا جی اندر سے پگھل اُٹھا۔ تیز تیز قدموں سے چلتی وہ چھوٹے میاں کے کمرے میں آئیں اور بنڈل کرسی پر پٹخ، اُلٹے پیروں واپس نکل گئیں۔

چھوٹے میاں کمرے میں داخل ہوئے، گھڑی پر ایک نظر کی، ساڑھے بارہ ہو رہے تھے۔ کرسی پر سے بنڈل اُٹھایا، ابھی ایک قدم باہر اور ایک اندر ہی تھا کہ خالہ بی لپکی ہوئی آگئیں — ہاتھوں میں بڑا سا طشت سنبھالے، جس پہ جھالریں لگا ہوا سُرخ کپڑا لٹک رہا تھا۔

طشت میز پر پٹکا کر اُنھوں نے چھوٹے میاں کا کندھا جا پکڑ لیا۔ ان کی آنکھیں یوں گیلی گیلی تھیں کہ ماں کا جی کٹ گیا۔

”کہاں جا رہا ہے ؟“ اُنھوں نے تن تنا کر پوچھا۔

چھوٹے میاں نے کچھ جواب نہ دیا، سر جھکا لیا۔

خالہ بی نے بنڈل ہاتھ سے جھپٹ لیا۔ تلخی سے بولیں: ”اور یہ کیا ہے؟“
”چھوٹے میاں نے کوئی جواب نہ دیا تو ترشی سے بولیں:“ عید کا جوڑا ہے نا۔؟“
چھوٹے میاں پھر بھی سر جھکائے کھڑے ہی رہے۔
”کلموہے عید پہ کوئی ایسا ہلکا سا جوڑا بنایا کرتا ہے۔؟“
چھوٹے میاں نے چونک کر ماں کی طرف دیکھا جو غصے غصے بول رہی تھیں۔
”مقبول میاں کی بہو اور یہ بارہ آنے گز والا ریشم اشرم تو نہیں آئی تجھے۔ اپنی دلہن کو ایسا کپڑا پہناتے ہوئے؟“
چھوٹے میاں کو کوئی جواب ہی نہ سوجھا۔
”یہ جوڑے لے جا اور اپنی دلہن کو پہنا کر لے آ۔ اکیلے میں اُس کا جی گھبراتا ہوگا۔ یہاں چار میں جی بہلے گا۔“ اُنھوں نے سرخ بنڈل کی طرف نفرت سے دیکھا۔
”تجھ سے تو اتنا بھی نہ ہو سکا کہ ہلکی پھلکی کرن بانکڑی ہی خرید لیا ہوتا کہ ساڑی ساجری تو ہو جاتی۔“ اور اُنھوں نے طشت پر سے طشت پوش ہٹا دیا۔ چھوٹے میاں نے ایک ہی نظر میں دیکھ لیا۔ یہ وہ پانچ کامدار جوڑے تھے جو اماں نے بڑے چاؤ سے اپنی بہو کے لئے خود اپنے ہاتھوں تیار کیے تھے!!!

کملیشور

(ترجمہ ڈاکٹر عبدالودود)
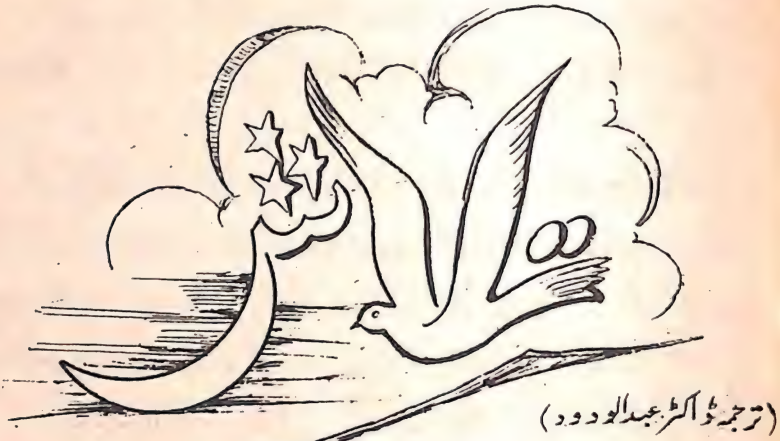
اس نے بہت دھیرے سے دروازہ کو دھکا دیا۔ وہ اندر سے بند تھا۔ جب تک وہ سوئی تھی تب تک دروازہ بند نہیں کیا گیا تھا۔ کمرے سے آوازیں بھی آتی رہی تھیں اور بھڑے ہوئے دروازے کے دراز سے روشنی کا ایک آرہ سا گرتا رہا تھا۔ روشنی مومیا کاغذ سے جھلملاتی رہی تھی۔ .... اور اس باریک لکیر میں سگریٹ کا دھواں طرح طرح کے پیٹرن بنا رہا تھا۔ بہت دیر تک وہ اِن عکسوں کو دیکھتی رہی تھی ....

اپنا دروازہ کھول کر وہ برآمدے میں نکل آئی۔ اس نے ان کے کمرے کے باہر والے دروازے کو ہلکے سے چھوا۔ وہ کھلا ہوا تھا۔ خاموشی سے وہ زینہ سے اُتری ..... گلی کا دروازہ بھی بند نہیں تھا۔ اسے کچھ شبہہ ہوا۔ ممی بغیر کچھ کہے اتنے سویرے کہاں نکل گئیں! ممی کے پاس کام بھی بہت تھا۔ مسٹر چندر کئی رجسٹر لے کر آئے تھے۔ دس یا ساڑھے دس بجے تو اس نے دونوں کو کافی پلائی تھی۔ گیارہ ساڑھے گیارہ بجے وہ خود سوئی تھی۔ وہ پیالے لے جانے کے انتظار میں کچھ دیر وہیں کمرے میں رکی رہی تھی تو ممی نے کہا تھا۔ "تو سو جا سمی ...... ہمیں تو ابھی دو تین گھنٹے لگ جائیں گے ...."

زینے سے وہ پھر اوپر برآمدے میں آگئی۔ آہستہ سے اُس نے ان کے کمرے کا دروازہ کھولا۔ نیچے قالین پر رجسٹر بکھرے ہوئے تھے۔ لال نیلی پنسلیں پڑی ہوئی تھیں۔ کاربن کا ڈبہ پڑا

تھا۔ نیلی لال دواتیں و ہولڈر رکھے تھے۔ کافی کے ایک پیالے میں جلی ہوئی تیلیاں، راکھ اور سگریٹوں کے بدرنگ ٹکڑے پڑے تھے۔

ممی شاید بہت تھک گئی تھیں۔ وہ پلنگ پر بے خبر سو رہی تھیں۔ جوڑے کے پن سرہانے رکھے ہوئے تھے۔ داہنی طرف والے تکیئے پر ایک ہلکا سا گڈھا تھا۔ پلنگ کے سرہانے والی پٹی پر ایک سگریٹ دبا کر بجھائی گئی تھی۔ ٹکڑا نیچے پڑا تھا۔

ان کے چہرے پر بے حد معصومیت تھی۔ اتنا ہی ڈھلا ڈھلا سا چہرہ تھا جتنا صبح اُٹھ کر منہ دھونے کے بعد نکھر آیا کرتا تھا۔ ساتھ ساتھ چائے پیتے وقت وہ اکثر بہت لگاؤ سے ان کے چہرے کو دیکھا کرتی تھی۔ ..... اوس میں دھلے کنول سی تازگی اُبھر آیا کرتی ہے ...... ممی کے چہرے پر۔ معلوم نہیں ایسا کیوں تھا۔ ممی کے چہرے میں کہ وہ ڈوبی ڈوبی سی دیکھتی رہ جاتی تھی!

وہ چُپ چاپ اُن کے کمرے سے نکل آئی تھی۔ اپنے کمرے میں آکر اُن کے جاگنے کا انتظار کرتی رہی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد اُن کے کمرے میں کچھ آہٹ ہوئی اور اسے ایسا لگا کہ ممی نے برآمدے والے دروازے کی چٹخنی بہت آہستہ سے بند کی تھی اور اتنے ہی دھیمے سے بیچ والے دروازے کی چٹخنی کھولی تھی۔ چٹخنی کھلنے کے بعد وہ ایک دم اُس کے کمرے میں نہیں آئی تھیں۔ چند لمحات تک چُپ چاپ وہیں کھڑی رہیں۔ پھر انھوں نے ہلکے سے آواز دی تھی۔ "سمی جاگ گئی؟" اور کمرے سے ہوتی ہوئی باتھ روم کی طرف چلی گئی تھیں۔ ان کے ساتھ ہی کمرے میں ایک ٹھنڈا سا جھونکا آیا تھا ...... ٹھنڈی سی مہک پھیل گئی تھی ...... جیسے وہ بستر سے نہیں غسل خانے سے نہا کر نکلی ہوں۔

جب تک وہ باتھ روم سے آئیں سمی نے چائے تیار کرلی تھی۔ وہ روز کی طرح ہی چائے پینے کے لئے بیٹھی تھیں۔ ساڑی انھوں نے ضرور کندھوں سے کہنیوں تک لپیٹ رکھی تھیں سلوٹیں کچھ زیادہ ہی تھیں۔ ساڑی کے نیچے ان کی بھری بھری سنگ مرمری باہیں جھلملا رہی تھیں آنکھوں میں اتھاہ گہرائیاں تھیں۔ ان کے بیٹھنے میں بھی روز جیسا پھیلاؤ نہیں بلکہ تناؤ تھا۔

"شاید مجھے دو روز کے لئے باہر جانا پڑے ..... گرانٹ باقی پڑی ہے۔ سال ختم ہونے سے پہلے سائنٹیفک انسٹرومینٹ خریدنے ہیں"۔ ممی نے نہایت آسانی سے کہا تھا۔

"میں یہیں رہوں گی ...... آپ ہو آیئے گا"۔ سمی نے دوسرا پیالہ بنا کر ان کے سامنے رکھ دیا تھا۔

"کسی دائی سے کہہ دوں گی۔ وہ یہاں سوجایا کرے گی۔ دو دن کی بات ہے۔" انھوں نے کہا تو سمی نے اتنی ہی آسانی سے منظور کر لیا۔ "جیسا آپ ٹھیک سمجھیں۔ دن کی تو کوئی دقت ہے نہیں آفس سے آنے میں ہی چھ بج جاتے ہیں۔"

"اس معاملے میں یہ گھر سیف ہے۔" انھوں نے کہا تو سمی نے ہمت سے جوڑ دیا۔ "یہ تو صحیح ہے ڈر بالکل نہیں لگتا۔"

اور وہ دونوں اپنے اپنے کام پر جانے کے لئے تیار ہونے لگی تھیں۔ اپنے کپڑے نکالتے ہوئے وہ دیکھ رہی تھی کہ ممی کچھ اُلجھن میں ہیں۔ بار بار وہ بلاؤزوں کو نکال کر دیکھ رہی تھیں۔ آخر انھوں نے باہنہ والا ایک بلاؤز نکال لیا۔ ان کے پاس وہ شاید اکلوتا تھا۔ اس کے ساتھ کوئی ساڑی بھی نہیں تھی۔ وہ ہمیشہ سلیو لیس ہی پہنتی تھیں۔ جیسے تیسے انھوں نے کنٹراسٹ بنا لیا تھا۔ اسے کچھ اٹپٹا سا لگا۔ ممی کے کھلے ہوئے بازو سچ مچ بہت خوبصورت اور سڈول لگتے تھے۔ .... کبھی کبھی تو اسے خود ان کے بازوؤں پر رشک ہوتا تھا۔

پھر وہ ڈریسنگ ٹیبل پر چلی گئیں۔ اور اس نے دیکھا کہ وہ ایک سمت سے بیٹھ کر بازوؤں کی پچھلی طرف ایک نشان پر بیس کریم لگا رہی تھیں........ شاید وہاں پر کوئی نیلا نشان تھا۔ اور انھوں نے باہنوں والا بلاؤز پہن لیا تھا۔

ایک لمحے کے لئے سمی کو وہ کچھ زیادہ عمر کی دکھائی دے رہی تھیں۔ لیکن وہ ٹوکنا نہیں چاہتی تھی۔ تیار ہو کر وہ بس کے آنے کا انتظار کرنے لگی تھیں۔ کالج کی بس میں اسٹاف کے لوگ بھی جایا کرتے تھے۔ وہ بارجے پر کچھ اس طرح کھڑی انتظار کر رہی تھیں جیسے اسکول کے بچے کرتے ہیں۔

سمی یہ سب دیکھتی رہی۔ وہ جب چھوٹی تھی تب بھی اسے اپنی ممی بہت خوبصورت لگتی تھیں۔ ان کے سڈول ہاتھ پیر، تراشے ہوئے نقش اور تازگی! ان میں ایسی تازگی تھی جو عمر کے ساتھ کھلتی آئی تھی۔ اس کی کسی سہیلی نے انھیں ماں نہیں سمجھا تھا۔ زیادہ سے زیادہ بڑی بہن ہی مانا تھا۔ ان کا رکھ رکھاؤ بھی ایسا تھا کہ اپنے جسم کے تناسب کو انھوں نے بگڑنے نہیں دیا تھا...... ان میں وہ لوچ اور نرمی تھی جو سمی کو خود میں لگتی تھی۔ ان کے جسم سے ایسی اچھوتی مہک پھوٹتی تھی جو سب کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔

مہینے میں ایک بار تو ان کا جسم اتنا تیز مہکتا تھا کہ .... سمی

بار بار کسی نہ کسی بہانے سے ان کے کندھوں پر اپنا سر رکھ دیتی تھی۔ تب جیسے خوشبو کا ایک جھرنا بہنے لگتا تھا۔

دو کمروں کا گھر اس وادی جیسا مہکنے لگتا تھا جس میں مشک والا ہرن آگیا ہو۔ پھر دو تین بعد وہ مہک دھیرے دھیرے ڈوبنے لگتی تھی ....

.... بس آئی اور ممی چلی گئیں۔ سمی انھیں جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ بس میں اسٹاف کے لوگ تھے اور کالج کی کچھ لڑکیاں بھی۔

ان کے جاتے ہی وہ اکیلی رہ گئی تھی۔ یکایک اُسے محسوس ہوا تھا جیسے سمی ہی باہر چلی گئی تھی۔ اور وہ ممی کی طرح گھر میں رہ گئی ہو۔ اچانک اس نے عجیب طرح کی ذمہ داری محسوس کی اور ان کے کمرے میں جاکر اس نے سب سامان قرینے سے لگانا شروع کر دیا۔ رجسٹر اور کاپیاں ایک طرف چھوٹی میز پر رکھ دیں۔ بستر جھاڑ کر کور کر دیا۔ بستر جھاڑتے وقت ضرور ایک ناقابل بیان سی تکلیف اُسے ہوئی تھی اور لگا تھا کہ ممی کی چیزیں چھونے کا اُسے کوئی حق نہیں ہے....... پھر کمرے میں کھڑے کھڑے فریم میں لگی وہ تصویر دیکھتی رہی تھی جس میں پاپا اور ممی کے ساتھ ننھی سی وہ خود بیٹھی ہوئی ہے۔ نہ جانے کیوں وہ اس تصویر کو اُٹھا لائی اور اسے اپنے کمرے میں رکھ کر اسکی جگہ ممی کے کمرے میں وہ تصویر رکھ آئی تھی جس میں سمندر اُمنڈ رہا تھا اور دور آسمان میں آبی پرندے اُڑ رہے تھے۔

اسے وقت کا خیال بھی نہیں رہا تھا۔ ایک صندوق کھول کر اُس نے پاپا کی وہ ڈائری نکالی تھی جس میں وہ ہر اہم واقعہ نوٹ کیا کرتے تھے۔ اس میں رشتہ داروں کے کچھ پتے، کچھ حساب، اور پیدائش کی تاریخیں لکھی ہوئی تھیں۔ ممی کی تاریخ پیدائش بھی تھی اور اس کی بھی...... دیکھا تو دنگ رہ گئی .... ممی کل انیس برس بڑی ہیں۔ بیس کی وہ انتالیس کی ممی!

ممی کی سالگرہ تب سے منائی ہی نہیں گئی...... سچ مچ ممی کو کتنا سونا لگتا ہوگا! آٹھ سال نکل گئے....... لیکن لگتا ہے، پاپا جیسے ابھی اٹھ کر چلے گئے ہوں۔ لیکن حادثہ میں ان کے مرنے کی خبر اب بہت پرانی سی لگتی ہے۔ ایک بیتی ہوئی بات کی طرح۔ لوگ ٹھہر جاتے ہیں مگر کچھ باتیں ہیں جو گذر جاتی ہیں..... پاپا کی باتیں تو جیسے گزر گئی ہیں۔ مگر وہ خود ابھی تک رُکے ہوئے ہیں۔ لیکن اب کچھ ایسا لگتا ہے جیسے پاپا ڈگمگا گئے ہوں اور چپ چاپ گھر سے چلے جانا چاہتے ہوں۔ گویا وہ اپنی غلطی محسوس کر رہے ہوں۔ یوں چپ چاپ آٹھ سال تک خاموش

بیٹھے رہ کر انھوں نے اچھا نہیں کیا۔

وہ آہستہ سے پاپا کو اُٹھا کر اپنے کمرے میں لے آئی۔ بہت دیر تک وہ چپ چاپ بیٹھی رہی اور اُنھیں دیکھتی رہی۔ وہ خاموش تھے انھوں نے کچھ نہیں کہا۔

شام کو ممی پہلے لوٹ آتی ہیں۔ وہ واپس آئی تو انھوں نے چائے بنالی تھی۔ گھر آکر ممی نے ساڑی بدلی تھی لیکن بلاؤز نہیں۔ جی تو چاہا تھا کہ پوچھ لے مگر محسوس ہوا تھا کہ بلاوز نہ بدلنے والی بات پوچھنے کا حق صرف پاپا کو ہے...... مگر وہ خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔

ممی تم کہیں گھوم آیا کرو۔ تم نے تو خود کو ایک دم باندھ لیا ہے...... اتنا کام کرتی ہو...... سمی بولی تو اُسے اپنی ہی آواز بہت بوڑھی سی لگی۔

ممی نے اُسے غور سے دیکھا تھا۔ سچ مچ اس کا وہ مطلب نہیں تھا۔ اپنی بات کو آسان بنانے کے لئے اُس نے آگے جوڑ دیا تھا: "تمھارے ساتھ ساتھ میں بھی نکل چلا کروں گی...... کبھی کبھی طبیعت بہت اُکتا جاتی ہے۔"

ممی کے ہونٹوں پر ہلکی سی مُسکراہٹ آگئی تھی۔

"چل آج پکچر دیکھ آئیں...... وہیں کچھ کھا بھی لیں گے۔" ممی نے کہا تھا۔

اس نے تجویز منظور کرلی تھی۔ ممی پھر ساڑی کے چناؤ میں اُلجھ گئیں تو اس نے اپنی ساڑی ان کے سامنے رکھ دی، "یہ پہن لو ممی...... بہت اچھی لگے گی۔" ایک لمحہ کی جھجک کے بعد انھوں نے سمی کی ساڑی باندھ لی تھی اور تتلی کی طرح تیار ہو گئی تھیں۔

گھر سے نکلتے وقت سمی نے بتیاں بجھائیں اور تالا لگایا تھا۔ زینہ سے اُترتے وقت ممی نے دھیرے سے کہا تھا "شاید بجلی کا بل ابھی تک پڑا ہوا ہے۔"

"میں کل جمع کرا دوں گی۔"

اور پھر دھیرے دھیرے اس نے سب حساب کتاب سنبھال لیا تھا۔ انڈے والے نے جب اس سے پوچھا تھا "میم صاحب کریم تو نہیں چاہئے؟" تو اسے کچھ اٹپٹا سا لگا تھا۔

خانگی اخراجات کے تمام کاغذات، بل، کیش میمو اس کے کمرے میں جمع ہو گئے تھے۔ دھوبی کی کتاب اس کی الماری میں آگئی تھی۔ دودھ والے کی پرچی اس کے پرس میں پہنچ گئی تھی۔

اس کی چار ساڑیاں اور ایک بلاؤز ممی کے کپڑے میں جا ملے تھے۔ وہ روز صبح ممی کے تیار ہونے کا انتظار کرتی۔ انھیں جو چپل پہنی ہوتی پہن لیتیں۔ اس کے بعد وہ کوئی سی بھی چپل پہن کر چلی جاتی۔

وہ خود ضد کر کے بھی ممی کو پہناتی تھی۔ اُس نے زبردستی اُن کا شال اُتروا کر کارڈگین پہنا دیا تھا۔

"یہ کیا تماشا کرتی ہے سمی...... تو کیا پہنے گی، بتا؟" ممی نے پیار سے جھڑکتے ہوئے کہا تھا۔

"میرے پاس کوٹ ہے"۔

"وہ پُرانا......"

اتنی جلدی کپڑے پُرانے نہیں ہوتے...... کل ڈرائی کلین کروالیا تھا، ایک دم نیا نکل آیا ہے"۔ وہ بولی۔

"بڑی کٹھن ہوگئی ہے"۔ ممی نے پیار سے کہا تھا۔

اور شام کو جب وہ لوٹی تو ممی کے کمرے میں پھر رجسٹر اور کاپیاں پھیلی تھیں۔ ٹرے میں چائے کے خالی برتن پڑے تھے۔ لال، نیلی دواتیں پڑی تھیں اور ایک پلیٹ میں سگریٹ کے ٹکڑے، راکھ اور تیلیاں تھیں۔ ممی بارجے پر جھکی ہوئی دور کچھ دیکھ رہی تھیں۔ شاید کچھ ایسا جو سڑک کی بھیڑ میں انھیں بالکل الگ دکھائی دے رہا تھا۔

سمی کا آنا انھیں معلوم نہیں ہوا۔ چند لمحوں بعد بارجے میں ہی وہ کچھ سوچتی سی کھڑی ہوگئی تھیں۔

"ممی چائے پی لو......" اُس نے پکارا تو وہ کچھ چونک سی گئیں۔ "مجھے معلوم ہی نہیں ہوا تو کب آگئی۔ چائے بھی بنالی...... میں ذرا تھک گئی تھی...... آج کل کالج میں کام بہت بڑھ گیا ہے۔ ایک بھی گھنٹہ فری نہیں ملتا...... ڈیمانسٹریٹر بھی چھٹی پر ہے...... تمام ٹوٹی پھوٹی باتیں کہتی ہوئی وہ سمی کے کمرے میں آگئی تھیں۔

ان کے ماتھے پر لال روشنائی سے ایک گول بندی بنی ہوئی تھی۔ روشنائی کی کناریاں سوکھ کر گوٹے کی لکیر کی طرح جھلملا رہی تھیں، پر وہ بندی اسے کُھل کر دیکھنے سے روک رہی تھی۔ شاید ممی کو کچھ اُلجھن ہونے لگے یا وہ برداشت نہ کر پائیں۔

"مجھے آج بہت کام کرنا ہے"۔ سمی نے دھیرے سے کہا تھا۔

"کچھ میں کرادوں؟" ممی نے سہارا دیا تھا۔

ہمارے یہاں ایک اور ایکسچینج کھل رہا ہے۔ کوڈ میسیجینز کے لئے۔ اس کی کلاسیز شروع ہوئی ہیں، انھیں لیسینز کو دُہرانا ہے"۔ سمی نے سمجھا دیا تھا۔

"تو اپنا کام کر........ کھانا میں بنا لیتی ہوں۔"

"سوپ بنا لو ممی، زیادہ بھوک بھی نہیں ہے سپلائیز تل لیں گے، بس ہو جائے گا۔

اچھا کہہ کر وہ اُٹھ گئی تھیں۔

پھر خاموشی چھا گئی تھی۔ دونوں کمرے دو الگ الگ دُنیا میں بدل گئے تھے۔ اس کے کمرے میں پاپا اب بھی رُکے ہوئے تھے۔ ممی شاید ان سے کچھ بات کرنا چاہتی تھیں۔ شاید انھیں لگ رہا تھا کہ پاپا کی غرض سے اب سمی ہی بات کر سکتی ہے۔ اور سمی کو لگا کہ یہاں سے نکل کر الگ چل دے تو پاپا بھی نہیں رُک پائیں گے۔ وہ اس کے ساتھ پیچھے پیچھے چلے آئیں گے۔ چُپ چاپ۔

اپنے کمرے میں جا کر ممی نے پرانے کاغذوں اور سامان کو الٹنا پلٹنا شروع کر دیا تھا۔ انھیں میں پاپا کے کچھ پرانے خط نکل آئے تھے۔ کچھ دیر بعد اُس نے ممی کو باتھ روم کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ لوٹ کر وہ آئیں تو منھ دُھلا ہوا تھا۔ بندی مٹی ہوئی تھی۔ چہرہ بہت تازہ لگ رہا تھا۔

سمی ذرا بڑی والی الماری کھسکانا ہے۔ اس کے پیچھے کچھ کاغذ گر گئے ہیں۔ آ تو ذرا......"

ممی نے کہا تو وہ اُٹھ کر گئی تھی۔ الماری کھسکائی تو کاغذوں کا ایک انبار لُڑھک پڑا اور وہ چھڑی بھی جو پاپا نے پہاڑ پر خریدی تھی۔ ایک بار ان کے پیر میں موچ آ گئی تھی۔ دھول کا ایک بگولا گرے ہوئے کاغذوں سے اُٹھا تھا۔ اور ممی بے طرح کھانسنے لگی تھیں۔

"تم نے اپنے کمرے میں کیا کیا جمع کر رکھا ہے ممی؟ اتنے سامان کے بیچ دم نہیں گھُٹتا؟ کچھ ادھر زینہ والی الماری میں رکھ دیتی ہوں۔" اس نے کہا تو انھوں نے اعتراض نہیں کیا۔ دونوں نے مل کر بہت سا سامان الماری میں لگا دیا تھا۔

چھڑی میں اپنے کمرے میں رکھوں گی۔" سمی نے کہا تو بات میں عجیب سا اٹپٹا پن دکھائی دیا، پھر وہ دھیرے سے پھر بولی "کبھی کبھی رات میں ادھر بلّی آتی ہے......" اور ممی جب سوپ بنانے چلی گئیں، تو زینہ والی الماری سے وہ پاپا کی فائلیں چپ چاپ اُٹھا لائی اور انھیں پلنگ کے نیچے رکھ لیا تھا۔

پاپا کا وہ بچا کھچا سامان جیسے ہر وقت ادھر اُدھر چلتا رہتا۔ وہ چھڑی اور وہ سامان اپنا ٹھکانا نہیں کھوج پا رہے تھے۔ تیسرے دن اُس نے سارے سامان کو میز کی نیچی والی پٹری پر سنبھال کر رکھ دیا تھا، لیکن صفائی کرتے وقت وہ وہاں سے بھی لوڑھک پڑا۔ الماری کے اندر وہ بڑی بڑی فائلیں کسی بھی سمت سے سماتی نہیں تھیں۔ الماری بہت تنگ تھی۔ ہار کر اس نے ایک گٹھری باندھ لی اور اسے پھر پلنگ کے نیچے رکھ لیا تھا۔ پاپا بھی رُکے ہوئے تھے۔

اسی دن ممی نے کہا تھا" میں آج رات کی گاڑی سے جاؤں گی۔ وہ کالج کے لئے سامان خریدنا تھا نا...... مارچ ختم ہونے سے پہلے پہلے پیمنٹ کرنا ہوگا۔ تیسرے دن آجاؤں گی۔ دائی سے میں نے کہہ دیا ہے۔ وہ رات کو ہوسٹل سے آجائے گی۔ یہی ساڑھے دس بجے"۔

" تمھاری گاڑی کس وقت جاتی ہے؟" آٹھ بج کر پانچ منٹ پر......؟"

"چپراسی آئے گا نا؟" سمی نے کہتے ہی اپنی غلطی بھانپ لی' تو اسے ٹھیک کر لیا" تمھارا سامان ٹھیک کر دوں......!"

" دو دن کی تو بات ہے' کون بہت سامان لے جانا ہے" ممی نے کہا اور وہ سوٹ کیس خالی کرنے لگیں۔

سمی نے ضد کر کے اپنی ساڑیاں اور پرس انھیں دے دیا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں کپڑے بدلنے چلی گئیں۔ سمی نے رومالوں کا ایک سیٹ رکھنے کے لئے سوٹ کیس کھولا تو جیب میں چپٹا سا پیکٹ پڑا دیکھ کر وہ بیحد شرما گئی تھی۔ سوٹ کیس بند کر کے اس نے رومال اوپر رکھ دیے تھے۔

ممی ساڑی بدل کر آئیں تو ان کے جسم سے مہک پھوٹ رہی تھی...... لیکن ان کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے ہچک ہو رہی تھی۔ تب ایک لمحے کے لئے اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ مہک پچھلے دو تین دن سے گھر بھر میں سمائی ہوئی تھی۔

ٹھیک سوا سات بجے نیچے ٹیکسی کا ہارن بجا۔ ممی یکا یک گھبرا سی گئیں۔ جلد بازی میں وہ اپنا سوٹ کیس اٹھا کر خود ہی سیڑھیاں اترنے لگیں۔ تب ہی ٹیکسی والا سردار اوپر آگیا تھا۔ سمی نے بستر اس کے لئے لڑھکا دیا اور ان کے ہاتھ سے سوٹ کیس لینا چاہا' تو انھوں نے بڑی آسانی سے کہا تھا" وہ لے جائے گا"۔

جب تک ٹیکسی والا سردار دوبارہ نہیں آیا۔ وہ وہیں سیڑھیوں پر رکی رکی اس سے بات کرتی رہیں" دائی ضرور آجائے گی...... ادھر کا دروازہ بند رکھنا........ روپے ہیں نا؟ ...... دائی سے کہنا وہ شام کا کھانا بھی بنا دے گی......!"

اور وہ ذرا تیزی سے سیڑھیاں اتر گئی تھیں۔ سمی بارجے پر آگئی۔ ٹیکسی کی کھڑکی سے انھوں نے اوپر دیکھتے ہوئے دھیرے سے ہاتھ ہلایا تھا۔ ٹیکسی چل پڑی۔ ادھر والی کھڑکی سے سگریٹ کا ایک سلگتا ہوا ٹکڑا سڑک پر گرا تھا۔ سمی وہیں کھڑی اس ٹکڑے کو دیکھتی رہی تھی۔

بہت سے صندوقوں میں سامان آیا تھا۔ ممی رات کو واپس آئی تھیں اس لئے صندوق گھر پر ہی اُتارے گئے تھے۔ وہ بہت خوش تھیں "ہمارے کالج میں جو انسٹرومینٹ اب آگئے ہیں کسی بھی کالج کی لیب میں نہیں ہیں"۔

اور گندے کپڑے نکلنے کے لئے جب انھوں نے ہولڈال کھولا تھا تو سب سے پہلے رومال نکال کر سمی کو دئے تھے "ایک بھی نہیں کھویا ...... پانچ یہ رہے۔ ایک پرس میں ہے! ٹھیک ہے نا.....!

ملگجے رومالوں میں اڑا اڑا سینٹ مہک رہا تھا۔ ایک ساڑی کے ساتھ اونی موزہ جھانک آیا تو ممی نے وہ ساڑی ہولڈال کی جیب میں دباتے ہوئے کہا تھا۔

ان دونوں کے بیچ پانی کا ایک ریلا آگیا تھا۔ وہ صرف کناروں کی طرح متوازی کھڑی رہ گئی تھیں۔ اور کبھی کبھی ممی اُسے دیکھ کر ایسے گھبرا اُٹھتی تھیں جیسے پاپا آگئے ہوں۔ اور وہ ممی کو دیکھ ایسے بے چین ہو اُٹھتی تھی جیسے پاپا چلے گئے ہوں۔ پر پاپا نہ تو آتے تھے نہ جاتے تھے۔ وہ صرف رُکے ہوئے تھے۔

آخر سمی نے دل کڑا کر کے ایک دن کہہ ہی دیا تھا "ممی یہاں سے مجھے آفس بہت دور پڑتا ہے۔ .... اس وقت ورکنگ گرلس ہوسٹل میں جگہ مل سکتی ہے .... اگر تم کہو تو میں وہاں سیٹ لے لوں۔......"

ممی یکایک سنجیدہ ہوگئی تھیں۔ انھوں نے غور سے سمی کو دیکھا تھا لیکن اس کے چہرے پر کہیں بھی ملال نہیں تھا۔ آنکھوں میں کوئی دوسرا رنگ نہیں تھا۔ اور لہجہ میں بھی تلخی نہیں تھی۔ سب کچھ نظری تھا۔

"وہاں تمھیں دقت ہوگی"۔ ممی کے لہجہ میں پیار تھا۔

"تو گھر بھاگ آؤں گی" سمی کے لہجہ میں بہت اپنا پن تھا۔ بات بہت آسان سی رہ گئی تھی۔ اس میں کوئی پیچ یا مروڑ نہیں تھا۔

پہلی تاریخ کو سمی ہوسٹل میں پہنچ گئی۔ ممی اس کے ساتھ آئیں اور کمرے میں سامان سجا گئی تھیں۔ کچھ چیزیں خرید کر دے گئی تھیں۔ بہت سی ہدایتیں دے گئیں۔ شروع شروع میں کچھ دنوں تو وہ ہر شام کچھ دیر کے لئے آتی رہیں کبھی سمی جاتی رہی۔ پھر دھیرے دھیرے ٹیلیفون پر ملاقات ہونے لگی۔ اور پھر اس میں بھی رکاوٹ پڑنے لگی۔

لیکن یہ اچھا ہوا تھا کہ پاپا اس کے ساتھ چلے آئے تھے۔ اب اسے پاپا پر بھی اتنا ترس

نہیں آتا تھا - وہ ممی کے محتاج نہیں رہ گئے تھے - اس نے انھیں آزاد کرالیا تھا - کہیں ہوسٹل کا

اکیلا پن کھانے دوڑ رہا تھا - سنکی لڑکیوں کے بیچ دم گھٹتا تھا - ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ سب

بھی پاپا کی طرح کہیں نہ کہیں رُکی ہوئی تھیں -

ایک دن وہ بالکل اکیلی تھی تو پاپا کے کاغذات کھول کر بیٹھ گئی - ڈائری کھولی تو

دیکھتے دیکھتے نظر پڑی ممی کی تاریخ پیدائش پر .... پاپا نے بڑے پیار سے ممی کے بارے میں

کچھ لکھا تھا، زندگی بھر آرام دینے کی قسم کھائی تھی - گیارہ سال پہلے انھوں نے وہ سب لکھا تھا ....

اُسے بڑا سکون ملا تھا - پاپا کی طرف سے اُس نے اُنھیں کی خواہش پوری کردی تھی - اس نے تاریخ

دیکھی تھی - تین دن بعد ہی ممی چالیس کی ہورہی تھیں -

اور وہ ممی کی سالگرہ پر بہت صبح صبح ہی نرگس کے پھولوں کا گچھا لے کر پہنچی تھی - وہاں پہنچ کر

یکایک وہ پس و پیش میں پڑ گئی تھی - اس وقت آکر اس نے اچھا نہیں کیا - شاید ممی کو اُلجھن ہو

اس کا اس طرح آنا کھل جائے - اسے کل فون کر دینا چاہئے تھا - لیکن لوٹتے بھی بن نہیں رہا تھا -

اس نے دھیرے سے دروازے پر دستک دی -

"آئی" ممی کی آواز تھی -

انھوں نے دروازہ کھولا تو سمی نے نرگس کے پھول لئے لئے ہی اپنے پیارے باہوں میں

کس لیا - پھر پھول ہاتھوں میں پکڑا دیئے -

ممی نے ایک بار سمی کو دیکھا تھا - پھر پھولوں کو دیکھتی اور سوچتی سی بولی تھیں " تیرے

پاپا بھی یہی پھول لاتے تھے "

پھر اپنے کو سنبھالتے ہوئے وہ جلدی جلدی گئیں اور چائے بنا لائی تھیں - پیالہ بیٹا کر

انھوں نے سمی کو آگے بڑھا دیا تھا - چائے پیتے ہوئے دونوں ہی اپنی اپنی جگہ بہت الگ الگ سی

ایک دوسرے کو ٹیک لینی تھیں - آخر ممی نے دھیرے سے پوچھ لیا تھا " سمی وہاں کوئی دقت

تو نہیں -؟"

"نہیں ممی ..... بس کبھی کبھی بہت سناٹا سا لگتا ہے "

" یہاں بھی بہت لگتا ہے " ممی نے کہا تھا - پھر وہ کچھ کھوئی کھوئی سی دیکھتی رہی تھیں

اور اپنے میں الجھتی ہوئی بولی تھیں " گھر میں ناشتہ بھی تو نہیں ہے، تجھے کیا کراؤں ؟"

" انڈے والا ابھی نہیں آیا ؟"

"اسے چھڑا دیا تھا۔" ممی کی آنکھیں ہلکی سی نم ہو آئی تھیں۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگیں۔ پھر اپنے پر ہی ہنستی ہوئی سی اُٹھی تھیں۔ کچھ اور سہارا نہ پاکر میز پر رکھے کلینڈر کو دیکھنے لگی تھیں۔ ہنستے ہنستے ہی بولی تھیں "جب سے تو گئی تاریخ ہی نہیں بدلی خیال ہی نہیں رہا۔"

اور سمی چاہتے ہوئے بھی کچھ کہہ نہیں پا رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ چلنے کے لئے اُٹھنے سے پہلے وہ زیادہ سے پوچھ پائے گی تو یہی کہ ممی کتنا بج گیا ہے ......

(ہندی کہانی)

بھاوے

(ترجمہ ڈاکٹر عبدالودود)
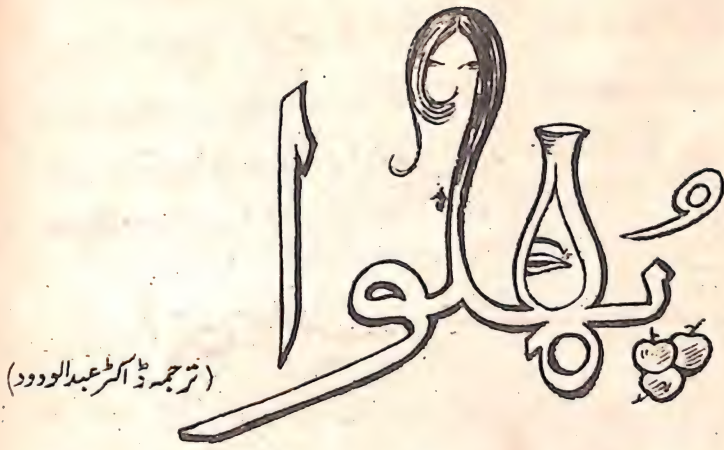
"جسم کی بھوک"۔ یہ الفاظ تو آپ نے سنے ہی ہوں گے۔ آج کل یہ بہت زیادہ رائج ہیں۔ اگر آپ جسم کی بھوک کا مطلب صرف پیٹ کی بھوک سمجھتے ہیں تو آپ بہت بھولے ہیں۔ آپ نے جدید ادب شاید نہیں پڑھا ہے۔ یہی نہیں اس کا مطلب ہے آپ ناگپور کے ہر ہفتہ لگنے والے بازار میں بھی کبھی نہیں گئے۔

ناگپور کے بازار میں سبزی، پھل سب ہی کچھ ملتا ہے۔ سنترے کے موسم میں سنترے بھی ملتے ہیں۔ یہ چیزیں پیٹ کی بھوک مٹانے والی ہیں۔ انھیں خریدنے پر آپ کی طرف کوئی گھور کر نہیں دیکھے گا۔ کوئی بھی آپ کے بارے میں اچھی یا بری رائے نہیں قائم کرے گا۔ لیکن ناگپور کے اس بازار میں چھتیس گڑھی عورتیں جگہ جگہ ٹوکریاں لئے کھڑی رہتی ہیں۔ ان چھتیس گڑھی عورتوں میں ایک خاص طرح کی رونق ہوتی ہے۔ ان کے جسم کی بناوٹ، ناک نقشہ اور انداز ایک خاص طرح کے ہوتے ہیں۔ لباس بھی ان کا انوکھا ہوتا ہے۔ چولیاں پہنے میں وہ یقین نہیں کرتیں۔ ان میں جو جوان ہیں وہ عموماً تیز اور ہوشیار ہیں۔ کچھ تو صرف خوبصورت ہی ہیں۔ آپ جو چیزیں بازار میں خریدتے ہیں۔ انھیں ایک معقول معاوضے پر

اپنے سر پر رکھ کر لے جانے کیلئے یہاں کھڑی رہتی ہیں۔
اگر آپ سبزی خرید کر اپنے راستے پر جلدی جلدی چلنے لگیں تو کوئی بات ہی نہیں اُٹھتی۔ لیکن اگر سبزی لے جانے کیلئے اپنے ساتھ کسی جوان چھتیس گڑھی عورت کو لے لیا تو یہ بات الگ ہے "بابو جی بوجھا؟" کہہ کر آگے آئی ہوئی عورت کو آپ صرف اجازت دیدیں تو اناج کا ڈھیر لگا کر بیٹھا ہوا مارواڑی آپ کی طرف گھورکر دیکھنے لگے گا۔ پاس بیٹھا ہوا پھل والا اپنے ساتھی کو آنکھ مارے گا۔ پڑوس کی سبزی والی اپنے گردن کو جھٹکا دیگی۔ اور چوک میں بیٹھا انڈے بیچنے والا، لنگوٹی پہنے وہ مسلمان زور زور سے کوئی غزل گانے لگے گا۔ راستہ میں اگر آپ کو کوئی ہم عمر مذاق پسند اور جان پہچان والا شخص مل گیا تو وہ چالاکی سے ہنسے گا۔ اور اگر کوئی ادھیڑ عمر شخص مل جائے گا تو وہ بُری نظر سے آپ کی طرف دیکھے گا۔ اتنا ہی کیوں اگر کسی خوبصورت لڑکی سے آپ نے بولی ٹھہرالی اور اس نے اپنی ٹوکری اُٹھالی تو اس کی ساتھ والی، زور زور سے بے ڈھنگی ہنسی ہنس کر اس کو کہنی ماریں گی۔
جسم کی بھوک کا مطلب صرف پیٹ کی بھوک نہیں۔ یہ بات ان سب عورتوں کو تو تجربہ نے اچھی طرح سمجھا دی ہے۔ پیٹ کیلئے یہ دھندا کرتے ہوئے وہ یہ اچھی طرح سے پہچان سکتی ہیں کہ آپ کی بھوک کون سی ہے ..... اور انھیں ٹھہرانے والے لوگ صرف بھوک سے پریشان نہیں ہیں، یہ آس پاس والے جانتے ہیں۔ اسی لئے آپ کی طرف کوئی گھور کر دیکھتا ہے، کوئی گردن جھٹکتا ہے، کوئی غزل گانے لگتا ہے۔ تو کوئی آنکھ مارنے لگتا ہے۔
ان سب کے بارے میں مجھے اچھی طرح سے معلوم ہے۔ اس لئے میں آج تک کبھی اس راستہ سے نہیں گیا۔ شادی شدہ نہ ہوتے ہوئے بھی اس کی مجھے ضرورت نہیں پڑی (اپنے سماج کی حسیناؤں کو مبارکباد) میرے پاس آنے والی مس روز کو مبارکباد! کامریڈ کملی کو مبارکباد! اور کتنی ہی عورتوں کو مبارکباد! انھیں کی وجہ سے میں آج تک ان خوبصورت لڑکیوں کے راستہ پر کبھی نہیں گیا۔ بکریوں کو دور بھگاتے ہوئے اناج کے ڈھیر کے سامنے بیٹھنے والے مارواڑی اس لئے مجھ پر کبھی نہیں ہنسے۔ سبزی والی نے میری طرف دیکھ کر کبھی گردن کو جھٹکا

نہیں دیا۔ انڈے والے نے مجھے نشانہ بنا کر کبھی غزل نہیں گائی۔ نرس روز کے ساتھ سنیما جاتے ہوئے بوڑھے بھی عزت اور رشک کے ملے جلے احساس سے دیکھتے۔ جب میں مِس سنیر گا دنکر کے ساتھ اسٹار کی پوائنٹ جاتا تو ہم عمر نوجوانوں کے پیٹ دکھنے لگتے۔ 'ڈائیلیکٹسکل میٹیریل ازم' کے لال سوال سلجھانے کیلئے جب میں کامریڈ کملی کے ساتھ کھنڈسی کے ڈاک بنگلے میں جاتا تو بھوک کے فلسفہ کے ماہر کالے نیلے پڑ جاتے۔ اور میں امریکی سرمایہ داری کا حامی ہونے کی وجہ سے چلانے لگتا۔ کچھ بھی ہو، میرا گناہ بازاری کبھی نہیں تھا۔ جدید تہذیب میں میرے گناہ کو گناہ کہنا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ میں غیر شادی شدہ تھا، فن کار تھا۔ اور سماج کے اعلیٰ طبقہ کی عورتیں میری طرف کھنچ آتی تھیں۔ سماج میری طرف کچھ کچھ عزت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ عورتوں کے ساتھ میرا بے تاڈان سے بات چیت کرنے کا طریقہ اور انھیں بس میں کرنے کی میری فن کاری قابلِ تعریف تھی۔ بازار کی خوبصورت لڑکیوں کی طرف میں نے کبھی ترچھی نظر سے نہیں دیکھا۔ زیادہ سے زیادہ میں نے کبھی کبھی ان کی طرف صرف دیکھا ہی تھا۔ میں اس وقت تک رنگیلے پن کی تہذیبی تقسیم کے بارے میں بہت سنبھل کر رہتا تھا۔

لیکن آج کا دن دوسرے اور دنوں سے بالکل جدا تھا۔ گناہ کی تہذیبی تقسیم کرنے کیلئے آج میں ہوش میں نہیں تھا۔ موہن تارا کی راہ دیکھتے دیکھتے آج میں بھڑک اٹھا تھا۔ وقت دے کر بھی وہ آج نہیں آئی تھی۔ میرے ٹائم ٹیبل میں چوکنے والی یہ پہلی عورت تھی۔ اصل میں ایک کے بعد ایک ہونے والی ملاقاتوں میں، میں نے اپنی مہارت سے مذاق کی ساری ابتدائی سیڑھیاں پار کر لی تھیں۔ پس و پیش ختم ہو گیا تھا۔ نسوانی تغافل ختم ہونے کو آیا تھا۔ اور آج........ لیکن آج موہن تارا آئی ہی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ بات کرنے کی ہنسنے کھیلنے کی دھن مجھ پر سوار ہو گئی تھی...... اور وہ آئی ہی نہیں۔

انجانے میں ہی میرا جسم بازار کی طرف بڑھنے لگا۔ میں بازار کی طرف کیوں جا رہا ہوں، کلب کی طرف کیوں نہیں جا رہا ہوں۔ یہ میں خود ٹھیک سے

نہیں پا رہا تھا۔ پیٹ کی بھوک مٹانے کیلئے مجھے کوئی چیز نہیں خریدنی تھی۔ کسی اور ہی بھوک سے میں نڈھال ہو گیا تھا۔ ایسی بات بھی نہیں تھی کہ بازار میں کھڑی خوبصورت لڑکیوں کے بارے میں میں نے کوئی مستحکم ارادہ کر لیا تھا۔ آج موہن تارا آئی ہی نہیں تھی۔ میرا جوانی ذہن بھڑک اُٹھا تھا۔ میرا سارا وجود متزلزل ہو گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا گویا موہن تارا کو ڈھونڈنے اور شیریں الفاظ کی بانسری بجا کر اسے اپنے پیچھے پیچھے لانے کیلئے میں باہر نکلا ہوں۔ اور صرف ایک عجیب احساس سے متاثر ہو کر سبزی بازار میں پہنچ گئے ہوں۔ میری آنکھیں ادھر اُدھر بھٹک رہی تھیں۔ اور جو بھی جوان لڑکی اُنھیں دکھائی دیتی وہ اس پر ٹک جاتیں۔

"بابو جی بوجھا"۔ ایک جوان عورت میرے سامنے آکر مجھ سے پوچھ رہی تھی۔ میں چونک گیا اور اس طرف دیکھتا ہی رہ گیا۔ چاروں طرف کے مناظر ہمیشہ ہی کی طرح تھے۔ چاروں طرف اناج، سبزی، مرچ، نمک، ان سب چیزوں کے ڈھیر نظر آرہے تھے۔ دکاندار چبوتروں پر بیٹھ کر اپنی اپنی چیزیں بیچ رہے تھے۔ ایک چبوترے پر بوجھ ڈھونے والی دس بارہ عورتیں پالتی مار کر بیٹھی تھیں۔ ان میں سے کچھ بجھی بجھی سی آنکھوں والی بوڑھی عورتیں تھیں۔ کچھ ادھیڑ تھیں اور کچھ ایک دم جوان۔ جس لڑکی نے مجھ سے بوجھا لے جانے کیلئے کہا تھا اُس نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔ اس کے جسم کی کھال ٹھنڈ کی وجہ سے کچھ کچھ پھٹ سی گئی تھی۔ لیکن اس کا چہرہ سولہ سترہ سال کی لڑکی کی طرح نرم و نازک تھا۔ اس کی آنکھوں میں کالاپن تھا۔ بھویں کھنچی ہوئی سی تھیں۔ دانت سفید تھے۔ ہنستے وقت اس کے گالوں میں کافی گہرے گڑھے پڑتے تھے۔ اس کا حسن تو آنکھوں میں سمو لینے کے لائق تھا ہی لیکن اس کا صحت مند، بھرا ہوا جسم زیادہ متاثر کر رہا تھا۔ وہ بہت پر کشش نظر آ رہی تھی۔ نرس روز کے نخرے، مس شرگادکر کی مردہ جوانی، کامریڈ کملی کا رنگا ہوا چہرہ، یہ سب اس خوبصورت لڑکی کے قدرتی حسن کے سامنے پھیکا لگ رہا تھا۔ اگر اس کے دھول سے بھرے پاؤں اور محنت مزدوری کرنے سے کھردرے ہوئے اس کے ہاتھوں کی طرف دھیان دیا جاتا اور اگر اسے بھڑکیلے کپڑوں میں سجا کر کسی کالج یا بزم خواتین میں لے جایا

جاتا تو وہ یقینی طور سے سب ہی کو اپنی طرف توجہ کر لیتی۔ اور یہ لڑکی مجھ سے پوچھ رہی تھی "بابو جی بوجھا؟"

مجھے بازار سے کچھ نہیں خریدنا تھا۔ لیکن جس لمحہ میں نے اس لڑکی کی آنکھیں دیکھیں، اس کی بھویں دیکھیں، بغیر چولی والا اس کا جسم دیکھا، اس کے گدرے ہوئے گال، پاؤں اور ہاتھ دیکھے۔ ابھرا ہوا جسم دیکھا اسی وقت میں نے جواب سوچ لیا۔

"ہاں!" گردن ہلاتے ہوئے میں نے کہا۔ "چلو ہمارے ساتھ۔" اور پھر کپڑے جھٹک کر اُس نے ٹوکری اپنے سر پر رکھ لی۔ اس کی ساتھیوں نے اسے کُہنی ماری۔ وہ سب بھدّے ڈھنگ سے ہنسنے لگیں۔ اناج بیچنے والا گھور کر دیکھنے لگا۔ سبزی والی نے اپنی گردن جھٹکی۔ پھل والے نے آنکھ ماری اور چوک میں لنگوٹی پہنے انڈے والا زور زور سے کوئی غزل گانے لگا۔

میں بالکل کھو گیا تھا۔ اس کا جسم دیکھتے ہی میرا سارا پس و پیش غائب ہو گیا تھا۔ وہ نرم سوئی کی طرح، پکی پھول گوبھی کی طرح تھی۔ میں اپنے اندر کی آگ سے جل رہا تھا۔ اور وہ بطخ کی طرح چلتی ہوئی میرے پیچھے آ رہی تھی۔ مجھے گھر پہنچنے کی جلدی تھی تاکہ میں جلدی سے اپنی بھوک ختم کر سکتا میں نے بلا وجہ ہی تھوڑا میوہ خرید کر اس کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ تھوڑے سے کیلے اور سنترے بھی خرید لئے۔ اس نے جب مجھ سے پوچھا "کوئی سبزی نہیں خریدنا ہے کیا۔" تو میں نے بلا وجہ تھوڑے آلو خرید لئے، اور جب میں یہ نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ اور کیا خرید دوں تو میں نے بچوں کا ایک کھلونا اور چکلا بیلن خرید ڈالا، اور اس سے کہا "اب گھر چلنا ہے۔" بلا وجہ ہی کچھ بولنے کیلئے۔ میں نے اس سے چلتے چلتے پوچھا۔ "تمھارا کیا نام ہے؟"

"پھُلوا!" وہ بولی۔

"بڑا میٹھا نام ہے۔" میں فوراً ہی بول اُٹھا۔

"کا ہے کا میٹھا نام بابو جی! جیسا نام ہونا چاہئے۔ ویسا ہے بس۔"

"تمھیں ناگپور آئے کتنے سال ہو گئے؟"

"ہو گئے تین چار سال۔"

"تمہاری عمر کتنی ہے؟"

"کون جانے بابو جی۔ ہو گی بیس بائیس۔"

"دھت! سولہ سترہ ہو گی۔"

"پھر سولہ سترہ ہی ہو گی۔" وہ بغیر کسی تحیّر کے بولی۔

"شادی ہو گئی یا نہیں؟"

"ہو گئی ہے۔"

"پھر تمہارا مالک کہاں ہے؟"

"چھوڑ کر چلا گیا۔"

"ارے!" اس کے دُکھ سے ہمدردی دکھانے کیلئے میں بولا۔ اس طرح کی ہمدردی میری تعلیم یافتہ دوستوں کو بہت عزیز تھی لیکن پھلو میری ہمدردی سے بالکل ہی غیر متاثر نظر آئی۔

"یہ تو چلتا ہی رہتا ہے۔" وہ اتنے ٹھنڈے پن سے بولی جو اس کی عمر کو زیب نہیں دے رہا تھا۔ گویا وہ مجھے ہی تسلی دینے لگی ہو۔

"کتنا کما لیتی ہو؟" میں نے بات بدلتے ہوئے کہا۔

اس نے ایک دفعہ میری طرف دیکھا' پھر بولی "کاہے کی کمائی! مزدوری ملتی نہیں۔ پیٹ بھر کھانے کو بھی نہیں ملتا۔"

"چار چھ روپئے؟" میں نے پوچھا۔

"کہاں کے چار چھ روپئے؟" لڑائی کے دنوں میں ملتے تھے۔ اب تو روپیہ بارہ آنے دیکھنے کو نہیں ملتے۔ کسی دن تمہارے جیسا داتا مل گیا تو بات الگ ہے۔" اس نے پھر ایک بار میری طرف دیکھا اور آگے بولی "پاس میں پیسہ ہونے سے بھی کیا فائدہ اتنے پیسوں میں کچھ ہوتا نہیں۔ پیسے دے کر بھی بازار میں گیہوں نہیں ملتا۔ چاول نہیں ملتا۔"

"چاول اور گیہوں!" عورتوں سے ایسے عام موضوع پر میں بات کرنے کا عادی نہیں تھا۔ کامریڈ کملی سے بھی میں نے دال چاول کے بارے میں کبھی

بات نہیں کی تھی۔ "گلاس آف واٹر تھیوری"۔ میکسم گورکی کے نسوانی کردار، ایسے ہی موضوعات پر ہماری گفتگو ہوتی۔ آج کل ہیں عورتوں سے پھول، تارے، سینما، موسیقی، شاعری، ساریوں اور زیوروں کے بارے میں بات چیت کرنے لگا تھا۔ اور یہ پھلوا نام کی خوبصورت لڑکی مجھ سے گیہوں، چاول کی باتیں بڑی تیزی سے کر رہی تھی۔

اس طرح کی باتیں کرتی ہوئی پھلوا میرے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ خاموش تھی۔ ذرا اُداس بھی تھی۔ اسکا چہرہ ذرا لال بھی ہوگیا تھا۔ اور اس کے ماتھے پر پسینے کی باریک بوندیں بھی چمک آئی تھیں۔

"سامان کہاں رکھنا ہے بابو جی؟" اُس نے پوچھا۔

"پہلے ٹوکری تو سر سے اُتار دو"۔ میں نے یوں ہی اُس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ یہ میرا خاص طریقہ تھا۔ بات کرتے کرتے میں کبھی کسی لڑکی کی پیٹھ پر یوں ہی ہاتھ رکھ دیتا تھا۔ میری پڑھی لکھی دوستوں پر اس کا ردعمل بڑا مناسب اور پر معنی ہوتا۔ اس لمس کی وجہ سے کوئی سمٹنا جاتی، کوئی شرما جاتی، کوئی غصہ دکھاتی تو کوئی مجھے اُلٹا چپت مارتی۔ اپنے لمس کا ردعمل جاننے میں مجھے بڑا لُطف آتا لیکن پھلوا پر اس کا کوئی خاص ردِعمل مجھے دکھائی نہیں دیا۔ وہ شرمائی نہیں۔ غصہ میں اُس نے میرا ہاتھ بھی نہیں جھٹکا۔ اور نہ ہی ہمت کر کے اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا۔ وہ ٹھنڈی ہی رہی۔ گویا میرا ہاتھ اس کی پیٹھ پر تھا ہی نہیں۔ اس کی یہ بے اعتنائی دیکھ کر مجھے چڑھ آ رہی تھی۔ میری محبت میں کوئی بھی عورت اتنی بے اعتنا نہیں رہی تھی۔ یا تو عورتیں مجھے چاہنے لگتی تھیں یا پھر نفرت کرنے لگتی تھیں۔ لیکن صرف یہ گنوار لڑکی میرے معاملہ میں بے اعتنا تھی۔ میرے کپڑوں، روپ، رعب کسی نے بھی اس پر کوئی اثر نہیں ڈالا تھا۔ میں نے جھٹکے سے اس کی سخت پیٹھ پر سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔ اور کھٹ سے دروازے کا کُنڈا لگا دیا۔

"کیوں پھلوا ڈر تو نہیں لگتا نا؟" میں نے چالاکی سے ہنستے ہوئے اس سے پوچھا۔

"ڈر کاہے کا بابو جی؟" وہ بولی۔
"میں نے دروازہ جو بند کر لیا!"
"بند دروازہ کیا کھلتا ہی نہیں بابو جی؟"
اس کا یہ جواب سن کر میں ٹھنڈا پڑ گیا۔ عورتوں کے ساتھ اکیلے میں دروازہ بند کر کے ان کا دل دیکھنے کی میری ہمیشہ کی ترکیب تھی۔ میرے دروازہ لگاتے ہی اعلیٰ طبقہ کی عورتیں سٹپٹا سی جاتیں، گھبرا جاتیں، یا ڈرنے کی بھڑکانے والی اداکاری کرتیں۔ دروازہ کھولنے کیلئے عاجزی سے درخواست کرتیں۔ لیکن بھلوا نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ وہ شرمائی نہیں۔ نہ ہی سٹپٹائی۔ جذبات بھڑکانے والی کوئی بھی پر لطف اداکاری اس نے نہیں کی۔ اُلٹے ٹھنڈے لہجہ میں اس نے مجھ سے پوچھا۔
"بند دروازہ کیا کبھی کھلتا ہی نہیں؟"
میں نے کچھ اُلٹی سیدھی باتیں بھی کیں لیکن بھلوا نے ان کا بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ اس سے میں بے چین ہو اُٹھا۔ اس سے مجھے چڑھ ہونے لگی اور اسی چڑھ میں، میں نے اس کے ہاتھ پکڑ لئے۔ میرے لمس کا رتی بھر بھی اس پر اثر نہیں ہوا۔ میرے اس جوش سے وہ بالکل متاثر نہیں ہوئی۔ میں جلتی آنکھوں سے اس کے چہرے کی طرف، اس کی بھوؤں کی طرف۔ اس کے نرم و نازک اور گٹھیلے جسم کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ کچھ کچھ ویسی ہی نظر سے وہ ڈکری میں رکھے ہوئے میووں، سنتروں اور کیلوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ پکڑ رکھے تھے، لیکن پھر بھی اُس کا دھیان میری طرف نہیں تھا۔ گویا میں اس کمرے میں تھا ہی نہیں، اس میں صرف کیلے، سنترے اور میوے تھے۔ جیسے ان چیزوں کے درمیان میرا وجود ناقابل شمار ہو۔ وہاں اگر کسی کا وجود تھا تو ان پھلوں، ان میووں کا۔ خود بخود بھلوا کے ہاتھوں کی میری گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ میرے پاس جو عورتیں آتی تھیں، انھیں میں بڑا اہم شخص لگتا تھا، نہ کہ میرے گھر میں رکھی ہوئی چیزیں۔ مجھے صاف نظر آرہا تھا کہ بھلوا کا خیال اس بارے میں بالکل ہی مختلف تھا۔ میری بھوکی آنکھیں بھلوا پر ٹکی تھیں، لیکن اس

کی للچائی ہوئی آنکھیں بار بار پھلوں پر، ان میووں پر گھوم رہی تھیں۔

مجھے محسوس ہوا یہ لڑکی میرے مردانہ وقار کو ذلیل کر رہی ہے۔ اس کے ہاتھ ہلاتا ہوا میں زور سے چلایا۔ "پھلوا!"

پھلوا ہوش میں آتی ہوئی سی بولی۔ "یہ سامان کہاں رکھوں بابو جی؟"

"پھل اور میوہ اس الماری میں رکھ دو۔" میں بولا۔ "اور الماری کے مرتبان پونچھ ڈالو تب تک میں کپڑے بدلتا ہوں۔"

میرا کپڑے بدلنا ضروری ہو گیا تھا۔ پاس کے کمرے میں میں نے جوتے نکالے، ٹائی کھولی، دھاری دار پاجامہ پہنا اور ایک عجیب سی اندرونی کیفیت میں، میں نے پردہ ہٹا دیا اور پاس کے کمرے میں چلا گیا۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی میں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ پھلوا کی پیٹھ میری طرف تھی اور وہ مرتبان سے مٹھی بھر بھر کر برنی کے ٹکڑے منہ میں ٹھونس رہی تھی۔

"پھلوا!" میں چلایا۔

"بابو جی!" وہ ایک دم سے چونک گئی اور ہاتھ میں مرتبان پکڑے ہوئے چور کی طرح کھڑی رہی۔

"تم چوری کر کے کھا رہی ہو؟" میں جلدی جلدی اس کی طرف بڑھا۔

"پاؤں پڑتی ہوں بابو جی! کل دن بھر میں نے کچھ کھایا نہیں تھا۔ آج بھی کچھ نہیں ملا۔ بازار میں صرف ایک پیالی چائے پی تھی۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تم چوری کرو گی؟"

"غلطی ہو گئی بابو جی! بھوک کو میں بس میں نہیں کر سکی۔ کیا کہوں بچپن سے ہی ہمیشہ بھوکی سی رہتی ہوں اور جو سامنے آتا ہے وہی کھانے کو جی چاہتا ہے۔ اس پاپی پیٹ کی خاطر ہی تو ہمیں اپنا وطن چھوڑ کر یہاں آنا پڑا۔"

"چوری کرنے کیلئے!" میں غرایا۔

"معاف کرو مالک!" نیچے جھک کر اس کے میرے پاؤں چھوئے۔ نیچے جھکتے وقت اس کا پلہ پوری طرح گر گیا تھا لیکن اس کی کوئی خاص فکر اُسے

نہیں ہوئی۔

"اُٹھو پھلوا!"

ہاتھ پکڑ کر میں نے اُسے اوپر اُٹھایا۔ اس کا ہاتھ اس کے نرم و نازک جسم کے مقابلہ میں بہت سخت تھا۔ بہت کھُردرا تھا۔ اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لینے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ میرے ہاتھ اس سے کہیں زیادہ ملائم اور نرم ہیں۔ اس کا گرا ہوا پلہ میں نے اس کے کندھے پر ڈال دیا۔ اس کے لمس سے میرے جسم میں چنگاریاں اُڑنے لگیں لیکن اس کی بے اعتنائی میرا دم گھونٹے ڈال رہی تھی۔ اب بھی وہ برفی کے مرتبان کی طرف للچائی نظر سے دیکھ رہی تھی۔

"پھلوا!" میں بہت روکھی آواز میں بولا "وہ ساری برفی پہلے تم کھا لو!"

"ایسا کیسے ہوگا مالک؟"

"نہیں ہونے جیسا کیا ہو گیا کھا ڈالو!"

"چھی چھی!"

"تو کیا تمھاری جھوٹی برفی میں کھاؤں گا؟" میری یہ بات پھلوا کی سمجھ میں آ گئی۔ مجھے پھلوا چاہیے اس کی جھوٹی برفی نہیں۔ یہ بات اسے زیادہ بہتر منطقی معلوم ہوئی۔ برفی کی طرف دیکھتی ہوئی وہ بولی "سچ مچ کھا لوں میں یہ برفی؟"

"سچ مچ کھاؤ، یہ برفی کھاؤ، یہ میوہ کھا لو اور یہ پھل بھی کھا ڈالو۔"

میں نے ساری چیزیں اس کے سامنے رکھ دیں اور بولا "کرو شروع!"

میری بات سن کر وہ تھوڑی دیر ہچکچائی۔ حالانکہ ان سب چیزوں کو اپنے سامنے رکھا دیکھ کر۔ اس کے منہ میں پانی آ گیا تھا۔ پھر بھی وہ بولی۔ "نا، ہیں چاہیئے مجھے!"

"چپ چاپ کھاؤ نہیں تو پولیس کو بلاؤں گا اور اس سے کہوں گا کہ یہ لڑکی چور ہے!"

"پولیس؟" پولیس کا نام سنتے ہی، پھلوا ہکا بکّا رہ گئی۔ پولیس کے بارے میں اسے کتنا اور کیسا تجربہ تھا کون جانے۔ سولہ سترہ سال کی عمر میں اس نے دنیا کا کتنا تجربہ حاصل کر لیا تھا، یہ جاننا مشکل تھا! میرے لمس

سے نہ لرزنے والا اس کا جسم، پولیس کے نام سے لرز اُٹھا۔ اور وہ بولی۔
"پولیس؟ نہیں نہیں میں کھاتی ہوں!"
اور دوسرے ہی لمحہ وہ آرام سے نیچے بیٹھ کر، ان سب چیزوں میں ڈوب گئی۔ وہ میرا وجود بھی بھول گئی تھی۔ وہ جگہ اور وقت بھول گئی تھی اور جلدی جلدی کھانے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ پہلے کون سی چیز کھائے اور بعد میں کون سی! وہ برفی کے بڑے بڑے ٹکڑے منہ میں رکھ رہی تھی۔ اور اُنہیں کے ساتھ کیلا منہ میں ٹھونس رہی تھی۔ ایک ہاتھ وہ حلوا اور دوسرے سے کاجو اُٹھا رہی تھی۔
میں نے دیکھا کہ اس کے گورے گال پھولے ہوئے تھے۔ اور بھویں کمان کی سی تھیں۔ کتنی خوبصورت تھی وہ لڑکی۔ بناؤ سنگار اسے کتنا زیب دیتا۔ لیکن وہ مہذب فنونِ آرائش سے بالکل ناواقف تھی۔ اس میں شاید اسے کوئی دلچسپی بھی نہیں تھی۔ اس کی بھوک نرالی تھی، اور میری بھوک بھی کچھ کم نرالی نہیں تھی۔ اس کے پیٹ کی بھوک نے جسم کی بھوک کو پوری طرح مار دیا تھا۔ مرد کا لمس اس کیلئے نیا نہیں تھا۔ مرد بہت سے آتے ہیں اور جاتے ہیں، لیکن ویسی چیزیں بار بار کھانے کو نہیں ملتیں۔ اس خیال سے وہ اپنی بھوک مٹا رہی تھی۔ ایک ہفتہ میں جتنا، میں کھا سکتا تھا، اتنا اس نے صرف دس منٹ میں کھا لیا تھا۔ چھی! میں، میرا وجود، میری نظر، میری ہوس یہ سب یک طرفہ تھا۔ ایک دم بیکار تھا۔ پُھلوا کسی مشینی گڑیا کی طرح ہی بے جھجھک لگ رہی تھی۔ اس کا ٹھنڈا ہاتھ میں پکڑ سکتا تھا۔ اس کے کندھے میں ہلا سکتا تھا، لیکن اس عمل میں کہیں زندگی نہیں تھی۔ کہیں بھی کسی طرح کا لطف نہیں تھا۔ اس کا رجحان صرف کھانے میں ہی تھا۔ اس کا سارا وجود اسی عمل میں مرکوز ہو کر رہ گیا تھا۔

میں جھنجھلا کر دور ہٹ گیا۔ تھکان سے میری بھوک مرگئی تھی، جیسے اس کی مر گئی تھی۔ اس کے اس خوبصورت لیکن کھانے میں مصروف

جسم نے مجھے شکست دے دی تھی۔ لیکن میرے دور ہٹنے کے بارے میں وہ اتنی ہی ناواقف تھی جتنی میرے لمس کے بارے میں بے اعتنا تھی۔ وہ اب بھی کھا رہی تھی۔ اس نے برفی، کیلے، حلوہ، سنترے، اور میوے ساری چیزیں ختم کر ڈالی تھیں۔ ان جانے میں اُس نے سامنے رکھی ہوئی صراحی اُٹھالی اور غٹاغٹ اس کا پانی پی کر اس نے ڈکار لی۔ تب ہی اچانک ہوش میں آکر اُس نے میری طرف دیکھا اور بولی "بابو جی میں نے چوری کی، مجھ سے غلطی ہو گئی"۔

"پھلوا اب تم جاؤ"۔ میں نے کہا۔

"نہیں نہیں بابو جی ایسا کہیں ہوا ہے؟" اور وہ پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ ساکت، بے جان گڑیا کی طرح۔

معلوم نہیں کیوں مجھے یکایک پھلوا پر غصہ آنے لگا۔ اپنے پر غصہ آنے لگا تھا۔ ساری دنیا پر غصہ آنے لگا تھا۔ تھکے اور چڑھے لہجہ میں، میں بولا۔ "اُٹھاؤ ٹوکری اور جاؤ یہاں سے"۔ اتنا کہہ کر میں نے اس کی طرف ایک روپیہ کا سکہ پھینک دیا۔

پھلوا لمحہ بھر کے لئے ہچکچائی۔ جس للچائی نظر سے اس نے کچھ دیر پہلے کھانے کی چیزوں کی طرف دیکھا تھا اسی للچائی نظر سے اب وہ اس سکہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ لڑکھڑاتی ہوئی وہ سکہ کے پاس آپہنچی۔ اس نے سکہ ہاتھ میں اُٹھا کر کان میں لگایا اور دوسرے ہی لمحہ وہ دروازہ سے باہر ہو گئی۔ گویا اگر وہ وہاں رُک جاتی تو اُس سے اس سکہ کا چھن جانا ممکن تھا۔

میں نے اطمینان کی سانس لی اور تھکی ہوئی طبیعت سے آرام کرسی میں اپنے جسم کو دھنسا دیا۔ آج میری بھوک ختم ہو گئی تھی۔

(مراٹھی کہانی)

نادر کتب
نکاتِ مجنوں
تنقیدی حاشئے اور کچھ نئے مضامین ۔/5
مجنوں گورکھپوری
تحقیق و تنقید
کچھ نئے مضامین اور "تنقید جدید" اور "تحقیق و تنقید" کے بیشتر مضامین کا یکجا ایڈیشن۔ اختر اورینوی
3/75
تنقید و تجزیہ
اردو میں قصیدہ نگاری کے بعد دس تنقیدی مضامین کا مجموعہ۔
ابو محمد سحر ۔/3
نئے ادبی رجحانات !
ترمیم شدہ پانچواں ایڈیشن جس میں اس بار دو نئے مضامین "پیروڈی اور رپورتاژ" کا اضافہ کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر اعجاز حسین 3/75
ضدی
عصمت کا مشہور ناولٹ جو فلمایا بھی جا چکا ہے۔
عصمت چغتائی 2/50
چار دل چار راہیں
خواجہ احمد عباس کا پہلا ناول جو فلمایا بھی جا چکا ہے۔
خواجہ احمد عباس 3/50
گاندھی نامہ
چار جلدوں پر مشتمل کلیات اکبر کے بعد یہ پانچواں مجموعہ۔
اکبر الہ آبادی 2/50
کتابستان الہ آباد ۲
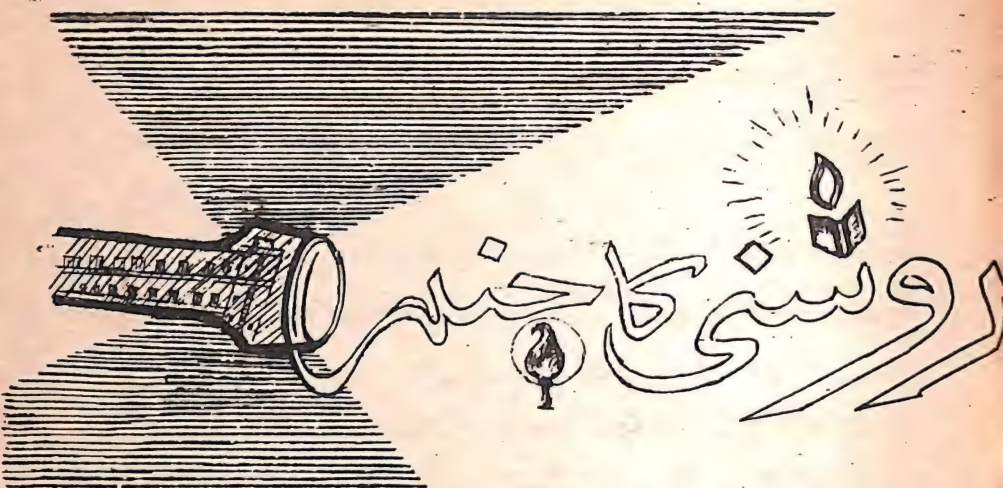
احمد رشید شیروانی

آج سے پندرہ سال پہلے ایک چھوٹی سی کمپنی سسک رہی تھی۔ اس کمپنی کا نام گریٹ ایسٹرن الیکٹرک ویلیئرس لمیٹڈ تھا۔ سرمایہ سب کا سب لگ چکا تھا۔ اس میں سے خاصا حصہ پہلے تین چار برس ہی میں مسلسل نقصانوں کی نظر ہو گیا تھا۔ بہت سارا مال بنا ہوا گودام میں پڑا تھا اور اونے پونے بھی بکنے کا نام نہ لیتا تھا۔ اتنا پیسہ نہ تھا کہ اس مال کو بیچنے کے لئے سیلز مین رکھے جائیں یا کسی طرح سیلز آرگنائزیشن بنا کر یہ مال بیچا جائے۔ یہ کمپنی زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھی۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ کون سا دن اس کی زندگی کا آخری دن ہوگا۔

اس کمپنی کے مینیجنگ ڈائرکٹر جناب مصطفےٰ رشید شیروانی دن رات اسی فکر میں ڈوبے رہتے کہ آج بلٹیاں چھڑانے کے لئے پیسہ کہاں سے آئے، کل ملازموں کو تنخواہیں دینے کے لئے کس سے قرض لیں۔ ملازمین تھوڑے ہی تھے۔ ان کی تنخواہیں بیحد مختصر اور قلیل تھیں لیکن کمپنی کے پاس مختصر اور قلیل رقم بھی نہ تھی۔

مہینہ کی وہ تاریخ جس پر محنت کش کو اس کی اجرت ملتی ہے، ایک مبارک تاریخ ہوتی ہے۔ مہینہ بھر محنت کرنے والا ہر شخص بے چینی سے اس تاریخ کا انتظار کرتا ہے۔ گھر پر اس کی بیوی اسی تاریخ کا انتظار کرتی ہے۔ صرف مہینے پر تنخواہ پانے والے ہی تنخواہ کے دن کا انتظار نہیں کرتے

وہ بیوپاری، دودھ والے، سبزی والے، گوشت والے جو لوگوں کو مہینہ بھر یہ چیزیں سپلائی کرتے رہتے ہیں تنخواہ کے دن کا انتظار کرتے ہیں جب کہ تنخواہ پانے والے ان کا حساب چکائیں گے جب یہ تاریخ قریب آتی ہے تو انتظار کی شدت اور بیتابی قریب ہو جاتی ہے۔ دل چاہنے لگتا ہو کہ یہ تاریخ کل کی آتی آج آجائے۔

لیکن آج سے پندرہ سال پہلے ایک شخص کا دل اس تاریخ کے خیال سے گھبرا اٹھتا تھا۔ شیروانی صاحب جب یہ سوچتے تھے کہ تنخواہ دینے کی تاریخ آ رہی ہے تو وہ کانپ جاتے تھے کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ کمپنی کے پاس پیسہ نہیں، لوگوں کو تنخواہ کیسے دیں گے۔ جتنا روپیہ انھوں نے یہ کمپنی کھولنے سے پہلے دوسرے کاروباروں میں کمایا تھا وہ سب لگ چکا تھا، خرچ ہو چکا تھا، جتنی جائداد انھیں ترکے میں ملی تھی وہ بک چکی تھی یا گروی رکھی جا چکی تھی اور اس کا روپیہ بھی کمپنی میں لگ چکا تھا۔ یہاں تک کہ ان کی بیگم صاحبہ کے زیورات تک گروی رکھے جا چکے تھے۔ پھر بھی روپے کی ضرورت! آج بمبئی سے بیل آ گیا۔ بلٹی چھڑانے کے لئے دس ہزار روپیہ چاہئے۔ کل کلکتہ سے مشین آ گئی ڈلوری لینے کے لئے روپیہ چاہئے۔ پھر سامنے تنخواہ کا دن۔ اس ہیجان اور پریشانی کے عالم میں شیروانی صاحب کو کچھ لوگوں نے رائے دی کہ کمپنی کو دیوالیہ ہو جانے دیں اور خود کہیں جا کر ہزار ڈیڑھ ہزار روپیہ کی ملازمت کر لیں۔ کمپنی کا دیوالہ نکلنے پر اس کے مینیجنگ ڈائرکٹر پر کوئی شخصی ذمہ داری نہیں آتی۔ اسی لئے اکثر مینیجنگ ڈائرکٹر صاحبان جب حالت خراب دیکھتے ہیں تو چپکے سے اپنا روپیہ جتنا ہو سکتا ہے نکال کر خود ہی کمپنی کو دیوالیہ قرار دلوا دیتے ہیں۔ جن لوگوں کا روپیہ لگا ہوتا ہے ڈوب جاتا ہے۔ کوئی شخص اپنا روپیہ مینیجنگ ڈائرکٹر سے وصول نہیں کر سکتا کیونکہ قانون کی نظر میں مینیجنگ ڈائرکٹر کی حیثیت کمپنی کی حیثیت سے جداگانہ ہے۔ لیکن شیروانی صاحب کے لئے یہ کمپنی صرف ایک بیوپار یا بزنس نہ تھی۔ اس کمپنی کے ساتھ اُن کا نام، ان کی آن، ان کی عزت وابستہ تھی۔ وہ کسی ایسے خاندان سے تعلق نہ رکھتے تھے جہاں پشتہا پشت سے ہی بیوپار ہوتا ہے جن کے یہاں دیوالہ نکلنا معمولی چیز سمجھی جاتی ہے جہاں بیوپاری اطمینان کے ساتھ پنجے جھاڑ کر الگ ہو جاتا ہے اور روپیہ لگانے والے لوگ اپنی قسمت کو پیٹتے رہ جاتے ہیں۔

شیروانی صاحب ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جس کے لئے تجارت ذریعۂ عزت یا دولت نہیں تھی بلکہ ذریعۂ خدمت تھی۔ اُن پر سیکڑوں لوگوں نے بھروسہ کر کے روپیہ لگایا تھا۔ سیکڑوں لوگ ان کی کمپنی میں روزگار کمانے کے لئے ملازم تھے۔ شیروانی صاحب ان کو ناامید

نہیں کر سکتے تھے۔ اُن کا اعتماد توڑنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ جمے رہے۔ انھوں نے ہر مشکل کا مقابلہ کیا۔ ہر مرتبہ روپیہ کے لئے دوڑ دھوپ کی۔ ہر ممکن کوشش کی اور جیسے بھی ہوسکا کمپنی کو زندہ رکھا۔

اسی زمانے میں ملک میں کروڑوں روپیہ کی ٹارچیں باہر سے آرہی تھیں اور کروڑوں روپیہ کا قیمتی بدیسی زرمبادلہ (فارن ایکسچینج) ضائع ہو رہا تھا۔ ٹارچ ضروریات زندگی میں سے ایک ہے۔ ہمارے ملک کے کونے کونے میں ہر طبقہ اور پیشہ کے لوگ ٹارچ استعمال کرتے ہیں۔ شیروانی صاحب اور ان کے ساتھیوں نے سوچا کہ اگر کمپنی پائدار اور عمدہ قسم کی ٹارچیں بنا سکے تو ایک طرف تو ملک کو کروڑوں روپیہ کے فارن ایکسچینج کی بچت ہوگی، دوسری طرف کمپنی بھی منافع کما سکے گی۔ شیروانی صاحب نے فیصلہ کیا کہ وہ ٹارچیں بنائیں گے۔

کوئی نئی چیز بنانے کے لئے کچھ نئی مشینوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ نئی ڈالیاں اور ٹول بنانے ہوتے ہیں۔ نئی چیز کو فروخت کرنے کے لئے سیلز آرگنائزیشن کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک طرف تو کمپنی یوں ہی سسک رہی تھی اور اس کا بہت سا مال بنا ہوا گوداموں میں بھرا پڑا تھا، اسکے پاس پیسہ کی سخت کمی تھی۔ دوسری طرف یہ ٹارچیں بنانے کا فیصلہ ہوا جس کے لئے اور زیادہ روپیہ کی ضرورت تھی۔ شیروانی صاحب کی جگہ کوئی اور ہوتا تو یہ خیال بھی نہ کرتا اور سب سے پہلے اپنے پُرانے مال کی فروختگی کا انتظام کرتا۔ لیکن شیروانی صاحب کی نظر مستقبل پر تھی۔ انھوں نے یہ دیکھ لیا کہ ٹارچ ایک ایسی چیز ہے جس کی ملک کو ضرورت ہے اور یہ ضرورت ان کی کمپنی پوری کر سکتی ہے، انھوں نے ٹارچیں بنانے کا فیصلہ کر لیا۔

ایک سب سے بڑی چیز جو شیروانی صاحب کو دوسرے سرمایہ داروں سے ممتاز کرتی ہے وہ ہے کمپنی کے ملازمین سے اُن کے خصوصی اور اچھے تعلقات! جہاں دوسرے اداروں میں محنت کش مزدور اپنی فیکٹری کے مالک سرمایہ دار کو اپنا دشمن اور خون چوسنے والا سمجھتے ہیں وہاں شیروانی صاحب کی فیکٹری کے ورکر شیروانی صاحب کو اپنا ہمدرد، بہی خواہ اور اپنا ساتھی سمجھتے ہیں۔ شیروانی صاحب فخریہ کہتے ہیں کہ وہ اپنی فیکٹری کے اوّلین مزدور ہیں۔ ان کے سامنے سب سے پہلی چیز مزدوروں کا مفاد ہے اور مزدوروں کا مستقبل روشن اور درخشاں بنانا ان کی سب سے بڑی خواہش ہے۔

شیروانی صاحب نے اپنے مزدوروں سے کہا کہ اس وقت کمپنی کے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ یا تو وہ بند ہو جائے یا وہ ٹارچیں بنائے۔ جو مزدور یہ چاہتے ہیں کہ کمپنی بند ہو جائے وہ خوشی سے جا سکتے ہیں۔ جو یہ چاہتے ہیں کہ کمپنی چلے انھیں پھر کمپنی کو چلانے کے لئے ہر ممکن کوشش کرنی

ہو گی۔ محنت اور لگن سے کام کرنا ہو گا۔ کمپنی کے ایک ایک پیسہ کو ہر مزدور اپنا سمجھ کر بچائے گا۔

مزدوروں نے شیروانی صاحب کی آواز پر لبیک کہا۔ حیرت کا مقام ہے کہ تقریباً تمام ورکروں نے خوشی کے ساتھ اپنی تنخواہوں میں سے ۲۵ فیصدی کٹانے کی پیشکش کر دی تاکہ کمپنی یہ خرچہ بچا کر ٹارچیں بنا سکے۔ مزدوروں کے اس عزم اور ہمت کا اندازہ یوں کیا جا سکتا ہے کہ اس وقت کمپنی میں اکثر بڑے بڑے افسروں کی تنخواہیں ڈیڑھ دو سو روپیہ مہینہ سے زیادہ نہ تھیں اور کلرکوں کی تنخواہیں بمشکل ساٹھ، ستر روپیہ مہینہ تھیں اور مزدوروں کی اُجرت اور بھی کم تھی۔ ہر شخص پریشان حال تھا۔ لیکن اس حالت میں بھی لوگوں نے اپنے پیٹ پر پتھر باندھنے کا تہیہ کیا۔ اور کمپنی کو برقرار رکھنے کے لئے قربانی دی۔ اس فیکٹری کے ملازموں کی یہ قربانی جو مزدوروں اور شیروانی صاحب کی آپسی محبت پر، ایک دوسرے کے مکمّل اعتماد پر مبنی تھی، ایک شاندار مثال ہے۔ یہ مثال دوسرے سرمایہ داروں کو یہ سبق دیتی ہے کہ اپنے مزدوروں سے محبّت کرنے والا کبھی گھاٹے میں نہیں رہتا۔ اور جو سرمایہ دار مزدور سے محبّت کرے گا مزدور اسے اس کی محبت کا دس گُنا بدل دیں گے۔

دوسری طرف یہ مثال مزدوروں کے لئے بھی مشعلِ راہ ہے۔ جو مزدور اپنی فیکٹری کا ہمدرد اور بہی خواہ ہو گا اور اپنے کام سے اور اپنی فیکٹری سے محبّت کرے گا وہ یقیناً سرخرو اور کامراں ہو گا اور اپنے لئے ایک بہتر مستقبل تعمیر کر سکے گا۔

— اِدھر تو مزدوروں نے قربانی کی، اُدھر شیروانی صاحب نے روپیہ کے لئے آخری بار جان توڑ دوڑ دھوپ کی۔ اُنھوں نے اپنے ہر رشتہ دار اور دوست کو خط لکھے، تار دیئے۔ ہر ایک سے جو کچھ اسکے پاس تھا مانگا۔ کوئی گوشہ انھوں نے نہ چھوڑا، کوئی دقیقہ انھوں نے اُٹھا نہ رکھا۔ اسی زمانہ کی ایک اور مثال ہے۔ شیروانی صاحب کے ایک دوست گورنمنٹ سرونٹ تھے۔ سب جانتے ہیں کہ ایک مخلص اور ایماندار گورنمنٹ سرونٹ کے پاس روپیہ کہاں بچتا ہے۔ ایک دن شیروانی صاحب بہت پریشان تھے۔ ان کے دوست نے وجہ پوچھی۔ شیروانی صاحب نے اُنھیں اپنی پریشانی بتائی کہ ایک لمٹی آئی ہوئی پڑی ہے جسے چھُڑانے کے لئے پیسہ نہیں۔ ایک طرف ریلوے ڈیمریج چارج کرنے لگے گی۔ دوسری طرف اس مال کے بغیر پروڈکشن رُکا رہے گا، روپیہ ہر جگہ سے کوشش کرنے پر بھی نہیں مل رہا۔ یہ سُن کر شیروانی صاحب کے دوست اپنی بینک کی پاس بک لے آئے۔ ان کے اکاؤنٹ میں کُل پانچ ہزار روپیہ جمع تھا۔ انھوں نے شیروانی صاحب کو بلینک چیک دستخط کر کے دے دیا اور کہا کہ

اس میں سے جتنے روپئے چاہیں خود لکھ کر نکال لیں۔ یہ جانتے ہوئے کہ شاید کمپنی ناکام ہو جائے اور یہ روپیہ کبھی نہ واپس ملے، انھوں نے صرف ایک شریف اور ضرورت مند دوست کی مدد کرنے کے لئے اپنی تمام سیونگ شیروانی صاحب کے حوالے کر دی۔

بلٹی چھڑالی گئی، ٹارچیں اور تیزی سے بننے لگیں، بکنے بھی لگیں۔ روپیہ آنے لگا، رفتہ رفتہ حالت بہتر ہوگئی۔ ٹارچیں بہت عمدہ بن رہی تھیں، جہاں پہونچیں پسند کی گئیں، آرڈر آنے لگے۔ شیروانی صاحب کے دم میں دم آیا۔ انھوں نے اپنی کوششیں اور تیز کیں، یہاں تک کہ نظام حیدرآباد نے اس کمپنی میں روپیہ لگانا منظور کیا۔ زیادہ ٹارچیں بنانے کے لئے نئی مشینیں آئیں، مال آیا، نئے لوگ رکھے گئے اور زیادہ ٹارچیں بنیں اور ہوتے ہوتے یہ فیکٹری ہندوستان کی سب سے اہم ٹارچ فیکٹری بن گئی۔

مزدوروں نے جو تعاون کیا اُسے شیروانی صاحب بھولے نہیں۔ چند مہینے کے اندر تنخواہوں سے ۲۵ فیصدی کی کٹوتی بند ہوگئی۔ تنخواہوں میں اضافے ہونے لگے۔ اس کمپنی نے منافع کمانا شروع کر دیا۔ لیکن ابھی پچھلے چار پانچ سال کے نقصانات پورے نہ ہوئے تھے پھر بھی شیروانی صاحب نے حصہ داروں کو منافع دینے سے پہلے اپنے مزدور بھائیوں کو بونس دیا اور یہ کمپنی زیادہ بونس دینے میں پورے ملک میں مشہور ہوگئی۔

ساتھ ہی اس کمپنی نے مزدوروں کی بھلائی کے لئے چند ایسے کام کئے جو اپنی مثال آپ ہیں۔ اس کمپنی میں مزدوروں کی ایک کینٹین ہے جس میں اب تک چار پانچ آنے میں ایک مزدور ایک وقت کا پورا کھانا کھاتا ہے، گوشت، روٹی، سبزی، پھل، دال چاول اور سلاد اس کھانے کا حصہ ہوتے ہیں۔ اس فیکٹری میں ایک اسکول قائم کیا گیا جس کے ذریعہ سب مزدوروں کو لکھنا پڑھنا اور حساب سکھایا گیا۔ اس طرح اس فیکٹری سے جہالت کا نام و نشان مٹا دیا گیا ہے اور اس فیکٹری کا ہر مزدور خواندہ ہے۔ اس فیکٹری میں مزدوروں کا اپنا کوآپریٹو ہے، جہاں ضروریاتِ زندگی کی چیزیں مناسب قیمت پر ملتی ہیں۔ اس فیکٹری میں ہر اس مزدور کو جو مہینہ بھر پابندی سے کام پر آئے رگولارٹی بونس ملتا ہے۔ اگر مزدور اچھا پروڈکشن کریں تو انھیں پروڈکٹوٹی بونس ملتا ہے۔ سالانہ منافع کا آدھا حصہ مزدوروں کا ہوتا ہے جو انھیں سالانہ بونس کی شکل میں ملتا ہے اور پھر سب سے بڑی چیز جیب ویلفیر فنڈ ٹرسٹ ہے جس سے ایک معمولی ملازم کو جو سو روپیہ مہینہ پر کمپنی میں آتا ہے اور ۳۵ سال کام کر کے ریٹائر ہوتا ہے اسے تقریباً پچاس ہزار روپیہ ریٹائر

ہوتے وقت ملے گا۔ اس طرح اس کمپنی نے مزدوروں کی فلاح وبہبود کو اولین اہمیت دی ہے۔
اور یہ کمپنی اس کو اپنا طرۂ امتیاز سمجھتی ہے۔

۱۹۶۲ء میں اس کمپنی کا نام بدل کر جیپ فلیش لائٹ انڈسٹریز لمیٹڈ کردیا گیا۔ اب یہ کمپنی کروڑوں روپیہ کی ٹارچیں بنا رہی ہے۔ ۶۵-۱۹۶۴ء میں اس کمپنی کو ۲۸ لاکھ روپیہ کا منافع ہوا اور اکتوبر ۶۵ء سے لے کر اپریل ۶۶ء تک صرف سات مہینے میں اس کمپنی کو ۲۸ لاکھ روپیہ کا منافع ہوا۔ اب یہ کمپنی ٹارچوں کے ساتھ ساتھ بلب اور بیٹری سیل بنانے کے کارخانے قائم کر رہی ہے۔ بیٹری سیل کے لئے اس نے مشہور انگریزی کمپنی وانڈر سے معاہدہ کیا ہے۔ اب اس کمپنی کا سرمایہ پچاس ساٹھ لاکھ روپیہ سے زیادہ ہے اور اس کی کل ملکیت ڈیڑھ کروڑ روپیہ سے زیادہ ہے۔ اپنے حصہ داروں کو یہ کمپنی نہایت عمدہ منافع دے رہی ہے۔ اس کمپنی نے حال ہی میں روپیہ کا ڈیپازٹ لینا بھی شروع کیا ہے۔ ہر سال دس فیصدی منافع تک روپیہ جمع کرنے والوں کو ملتا ہے۔ اب سیکڑوں لوگ اس کمپنی میں روپیہ لگا رہے ہیں۔

یقیناً آج یہ کمپنی ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہے۔ لیکن یہ سب کچھ نہ ہوتا اگر شیروانی صاحب آج سے پندرہ برس پہلے ہمت ہار گئے ہوتے۔ یہ سب کچھ نہ ہوتا اگر اس مصیبت کے وقت میں کمپنی کے ملازموں نے شیروانی صاحب کا تن، من، دھن سے ساتھ نہ دیا ہوتا۔ یہ سب کچھ نہ ہوتا اگر دوست نے دوست کی مدد نہ کی ہوتی۔ یہ سب کچھ نہ ہوتا اگر خدا کو منظور نہ ہوتا۔ لیکن خدا نے اپنے بندوں کو ہمت، عزم اور استقلال سے محنت اور مشقت کرنے کی تلقین کی ہے اور ایسا کرنے والوں کی مدد کا وعدہ فرمایا ہے۔ اس وعدے پر شیروانی صاحب کو یقین کامل تھا۔ اس اعتقاد نے ہر مشکل گھڑی میں شیروانی صاحب کی مدد کی، انھیں ہمت اور طاقت دی۔ بالآخر انھیں کامیاب کیا۔
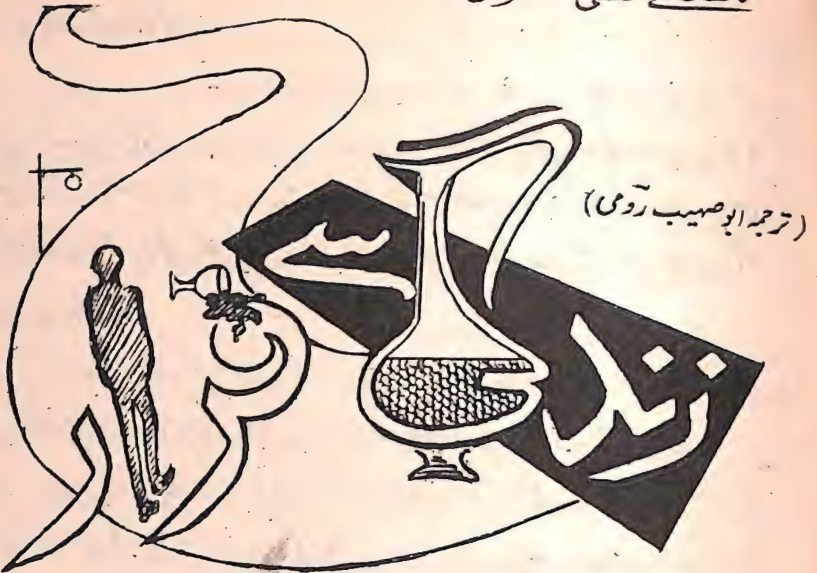
مصطفیٰ لطفی منفلوطی

قاہرہ میں بسلسلۂ ملازمت میرا قیام کئی سال تک رہا جہاں خالد جیسا دوست پا جانے کے بعد میں اپنے وطن اور اہل وطن سب ہی کو بھول گیا تھا۔

خالد میرا مخلص دوست ہی نہ تھا بلکہ وہ ایک مثالی انسان اور بے مثال رفیق تھا جو مجھے اپنی زندگی میں کافی تلاش و جستجو کے بعد ہی مل سکا تھا اور جس کے مل جانے کے بعد مجھے کسی اور دوست و رفیق کی ضرورت باقی نہ رہ گئی تھی۔

میں اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا ضروری کاغذات پر دستخط کر رہا تھا کہ روزانہ کی ڈاک میرے سامنے لائی گئی۔ ڈاک میں قاہرہ سے میرے اپنے وطن کے لئے تبادلہ کا حکم بھی تھا۔

وطن کا تبادلہ کتنی خوشی کی بات ہو سکتی ہے اس کے بیان کی مطلق ضرورت نہیں ہے۔ مگر مجھے تو کہنا ہی پڑے گا کہ خالد کی رفاقت چھوٹنے کی بنا پر اپنے وطن کے لئے میرا یہ تبادلہ بھی میرے لئے خوشی کا باعث نہ ہو سکا تھا اور چار و ناچار مجھے "قاہرہ" کو خیرباد کہنا ہی پڑا۔

روانگی کے وقت بہت دیر تک ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے اور اپنے اپنے رومالوں کو ہوا میں لہراتے ہوئے اپنے دلی جذبات کا اظہار کرتے رہے۔

قاہرہ سے وطن آئے مجھے کئی سال ہو چکے ہیں۔ شروع میں تو ہمارے درمیان خط و کتابت کا یہ وقفہ نہایت ہی مختصر رہا مگر جوں جوں ہماری مدت فراق طویل ہوتی گئی۔ مکاتبت کے وقفے بھی

طویل سے طویل تر ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ وہ وقت بھی آ گیا کہ ہماری مکاتبت نے آخری ہچکی لے کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دم توڑ دیا۔

وقت کے ساتھ ساتھ ہمارے حالات بھی بدل رہے تھے۔ مجھے اس کی مطلق خبر نہ تھی۔ کئی سال کے بعد وقت نے ایک اور کروٹ لی اور میرا تبادلہ دوبارہ قاہرہ کو ہو گیا۔ اس حکم نے سوکھے دھان میں پانی کا کام کیا اور میں نے محسوس کیا کہ پہلی بار جب میں قاہرہ گیا تھا اس وقت میرے دل کی جو کیفیت تھی وہ اس بار کی کیفیت سے کتنی مختلف تھی۔ پچھلی مرتبہ مجھے ڈاک بنگلہ میں ٹھہرنا پڑا تھا جہاں مجھے بالکل انجان اور اجنبی لوگوں سے سابقہ تھا۔

اس مرتبہ مجھے بالکل اطمینان تھا کہ قاہرہ میں "ڈاک بنگلہ" کے بجائے "خالد منزل" میں قیام کی پوری آسانیاں میرے لئے موجود ہیں جہاں اپنے گھر کے افراد کی طرح جانے پہچانے لوگ مجھے ملیں گے۔

چنانچہ قاہرہ پہنچتے ہی میں نے خالد منزل کا رُخ کیا اور تقریباً آٹھ بجے شب کو میری ٹیکسی اُس کے سامنے کھڑی تھی۔ مگر اس وقت میری حیرانی کی کوئی حد نہ رہی جب میں نے یہ محسوس کیا کہ اب یہ "خالد منزل" وہ "خالد منزل" نہیں نظر آ رہی تھی جو آج سے آٹھ سال پہلے تھی۔ اُس وقت تو یہ گویا جنّت کا نمونہ تھی جس کے مکینوں کے چہرے وفورِ مسرّت اور فرطِ انبساط سے کھلے ہوئے پھول لگ رہے تھے مگر آج اس وقت یہاں ایسی ویرانی برس رہی ہے کہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں "خالد منزل" کی بجائے کسی وحشت ناک مقبرہ کے سامنے کھڑا ہوں اور کبھی یہ خیال ہوتا کہ شاید میں خواب دیکھ رہا ہوں یا پھر غلطی سے میں کسی دوسری جگہ تو نہیں آ گیا ہوں۔ آخر کچھ دیر کے بعد میں نے ہچکچاتے ہوئے دروازہ پر دستک دی۔ اور کئی بار کی کوشش کے بعد دروازہ کی درازوں سے کوئی ٹمٹماتا ہوا چراغ اپنے جانب آتا ہوا دکھائی دیا اور ذرا دیر بعد دروازہ کھلا میں نے دیکھا کہ ایک ۱۰ سال کا بچہ میرے سامنے کھڑا ہے۔ ابھی میں اس بچہ کے

"السلام علیکم ورحمۃ اللہ اور مرحبا! مرحبا! کی شیریں آواز کا لُطف ہی لے رہا تھا کہ میرے کانوں میں بچہ کا یہ سوال جلترنگ بجانے لگا۔

جناب کون صاحب ہیں؟ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟

بچہ کے ہاتھ میں جو چراغ تھا اُس کی مدھم روشنی میں میں نے غور سے دیکھ کر اپنی یادداشت کی مدد سے اس کو پہچاننے کی کوشش کی۔ مجھے یاد آیا کہ یہ میرے دوست خالد کا وہی بچہ اسلم ہے جس کی پیدائش پر خالد نے ایک شاندار دعوت کی تھی۔

"تمھارے والد صاحب کہاں ہیں؟" میں نے دریافت کیا۔

"ابا جان اب گھر پر بہت کم رہتے ہیں رات گئے آتے ہیں اور صبح سویرے ہی چلے جاتے ہیں"۔ بچے نے جواب دیا۔ خالد کی روزمرہ زندگی کا یہ پروگرام میرے لئے بہت حیرت انگیز تھا۔ مزید تفصیلات معلوم کرنے کی شدید خواہش نے مجھے بے چین کر دیا۔ میں نے بچے سے کہا "اپنی امی جان سے میرا اسلام کہو اور ان کو بتا دو کہ ابا جان کے ایک بہت پرانے دوست مسعود راشدی دروازے پر آئے ہوئے ہیں ان کا تبادلہ پھر قاہرہ کے لئے ہو گیا ہے"۔

"آپ ادھر نشستگاہ میں تشریف رکھئے"۔ اسلم نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

کمرے میں داخل ہونے کے بعد میں سخت حیران کہ خدایا کیا یہ وہی ڈرائنگ روم ہے جہاں کبھی متعدد صوفہ سیٹ ہر طرح کے آرائشی و آسائشی سامان موجود تھے اور آج صرف دو ایک میلے کچیلے بوسیدہ پردے اور ٹوٹی پھوٹی چند کرسیاں ہیں جن پر کشن کی جگہ گرد کی دبیز تہیں جمی ہوئی تھیں۔

اگر دیواروں پر بنے ہوئے نقش و نگار کے دُھندلے نشانات پچھلے دور کی یاد نہ دلاتے تو میرے لئے یہ یقین کرنا بھی مشکل ہوتا کہ یہ وہی ڈرائنگ روم ہے مگر اب تو مجھے یقین کرنا ہی پڑا تھا۔

میں نہ جانے کن خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ اسلم کی آواز نے مجھے پھر اسی ڈرائنگ روم میں پہنچا دیا۔ "امی نے آپ کو سلام کہلوایا ہے اور کہا ہے کہ آپ ذرا دیر تشریف رکھیں مجھے آپ سے آپ کے دوست کے متعلق کچھ باتیں کرنی ہیں"۔

یہ پیغام سن کر میرا دل بُری طرح دھڑکنے لگا اور غیر شعوری طور پر مجھے ایسا لگا کہ آج یہاں خالد کے متعلق شاید مجھے کوئی بُری خبر سننی پڑے گی۔

ابھی میں انہی خیالات میں ڈوبا ہوا تھا کہ ڈرائنگ روم کے اندرونی دروازہ پر سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی ایک عورت آ کر کھڑی ہو گئی اور ایک نسوانی آواز میرے کانوں تک آئی۔ "السلام علیکم!"

میں نے نہایت ہی متفکرانہ انداز میں سلام کا جواب دیا اور ہمہ تن گوش بن کر بیٹھ گیا کہ دیکھئے بیگم خالد سے آج کیا باتیں سننے کو ملتی ہیں۔

محترم دوست! انھوں نے مجھے مخاطب کیا اور میں جی کہہ کر متوجہ ہو گیا۔

آپ کو شاید معلوم نہ ہو کہ آپ کے چلے جانے کے بعد خالد کا کیا حشر ہوا؟ خاتون نے مجھ سے سوال کیا۔

"جی نہیں مجھے کچھ بھی معلوم نہیں۔ میں ابھی ابھی یہاں آیا ہوں اور گذشتہ سات سال کے عرصہ میں میرا آنا یہاں بالکل نہ ہو سکا تھا جس کی وجہ سے مجھے مطلق خبر نہیں ہے۔

"کیا اچھا ہوتا کہ آپ قاہرہ چھوڑ کر کہیں نہ گئے ہوتے"۔ خاتون نے رندھی ہوئی آواز میں اپنی

بات شروع کر دی اور سلسلہ جاری رکھتے ہوئے بولی "آپ کی ذات خالد کے لئے بہت بڑی روک اور باندھ کی حیثیت رکھتی تھی۔ آپ کی بدولت وہ زمانہ کے حادثات وانقلابات سے محفوظ رہے۔ آپ کے چلے جانے کے بعد ان کے بہت سارے خودغرض دوست پیدا ہوگئے جنھوں نے ان کو غلط راستہ پر لگا دیا۔

ان غلط لوگوں میں خالد کے سکشن انچارج بھی تھے جن کے ساتھ رہ کر ان کو پینے پلانے کی بھی عادت پڑ گئی۔

شروع شروع میں تو مجھے اس کا اندازہ نہ ہوسکا اور میں نے اسی قدر تبدیلی محسوس کی تھی مسٹر خالد کو اپنے گھر سے اور گھر والوں سے تعلق کم ہوتا جارہا ہے۔ ان دنوں وہ گھر پر بہت کم رہتے۔ زیادہ وقت اپنے انھیں دوستوں میں گزارتے اور رات گئے آکر اپنے بستر پر سو رہتے۔ ان کا یہ رویہ میرے لئے بیحد تکلیف دہ اور ناقابل برداشت تھا مگر میں خاموش تھی کیونکہ ان دنوں سکشن انچارج کی دوستی نے خالد کے لئے بھی ترقی کے دروازے کھول دئے تھے اور ہماری مالی حالت پہلے سے بہت بہتر تھی۔

میری یہ خاموشی اور برداشت شاید برابر جاری رہتی مگر ہوا یہ کہ ایک دن خالد اس حالت میں گھر آئے کہ ان کے گلے میں بیحد جلن ہو رہی تھی جس کی وجہ سے وہ بُری طرح پریشان تھے۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر میں ان کے قریب گئی۔ تو ان کے مُنہ سے "بدبو کا ایک زبردست بھبھکا" مجھے محسوس ہوا اور اس وقت مجھے ان کے سارے حالات کا اندازہ ہوا اور اس وقت ساری دنیا مجھے گھومتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔

اب مجھے پتہ چلا کہ خالد کے سکشن انچارج نے خالد کو اپنا دوست نہیں بنایا تھا بلکہ اپنی رنگ رلیوں کی محفلوں کے لئے اس کو اپنا ندیم چُنا تھا اور اسی نے میرے عزیز شوہر کو بڑے غلط راستہ پر لگا دیا تھا۔

اس کے بعد میں نے خالد کو راہ راست پر لانے کی بہت کوشش کی۔ ہر طرح اس کو سمجھایا اپنے اور اس کے عزیزوں کو بیچ میں ڈالا سبھوں نے ہر امکانی صورت سے اُس کو نصیحت کی مگر وہ کسی طرح اپنی راہ تبدیل کرنے پر آمادہ نہیں ہوسکا۔

اس کو بدلنے کے لئے میں نے رو رو کر اپنی آنکھیں خشک کر دیں مگر اب وہ اس قدر بدل چکا تھا کہ میرے آنسوؤں کا سیلاب بھی اس کو اس کی جگہ سے نہ ہٹا سکا۔

میں اپنی تنہائیوں میں گھنٹوں اس انقلاب پر غور کرتی رہتی کہ یاخدا یہ کیا ہوگیا یہ وہی خالد ہے جو کسی وقت میں ایسی دواؤں کا استعمال بھی پسند نہ کرتا تھا جن میں شراب کی معمولی مقدار بھی

شامل ہوتی۔ با اب وہی خالد ہے جس کو شراب سے زیادہ دنیا کی کوئی چیز عزیز نہیں ہے۔

یہ انقلاب خالد کی زندگی کے کسی ایک پہلو میں محدود نہ تھا بلکہ اس کی ساری زندگی اس سے متاثر ہو چکی تھی۔ وہی خالد جو کبھی میرے اور اپنے بچوں کے لئے انتہائی مہربان اور شفیق شوہر اور باپ تھا اب وہی انتہائی ظالم اور بیدرد ہو چکا تھا۔ جس کو کسی زمانہ میں یہ بات بھی گوارا نہ تھی کہ باہر کا کوئی دوست میرا سایہ تک دیکھ سکے یا میری آواز بھی سُن سکے۔ آج وہی شخص رات کے وقت نشہ میں دُھت ہو کر اپنے ساتھیوں کو لئے ہوئے بالکل بیدھڑک گھر میں گھس آتا۔ دوستوں کی وجہ سے میں چھپی چھپی پھرتی اور اُس کے دوست نشہ میں چور کونہ کونہ میں میرا پیچھا کرتے پھرتے اور خالد پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ حیا سوز منظر دیکھتا اور تصویر بنا رہتا۔

خالد کی سرگذشت اس قدر سُنانے کے بعد بیگم خالد کی آواز بھرآ گئی اور وہ خاموش ہو گئیں۔ غور کرنے پر مجھے محسوس ہوا کہ وہ شاید رو رہی ہیں۔ خود میرا یہ حال کہ قریب تھا کہ میری چیخ نکل جائے لیکن میں نے اس وقت بیحد ضبط سے کام لیا اندیشہ مجھے یہ تھا کہ اگر بیگم خالد کو میری حالت کا اندازہ ہو جائے گا تو وہ اور بھی بے تابو ہو جائیں گی۔

تھوڑی دیر بعد بیگم خالد نے اپنی خاموشی کو خود ہی توڑا اور سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے بولیں۔

"چند سال تک ہم لوگ اسی طرح رہے مگر خالد کی حالت روز بروز بگڑتی ہی رہی۔ اب حالات نے اسکو اس پر مجبور کر دیا کہ وہ اپنے شوق کو پورا کرنے کے لئے قرض بھی لینے لگا۔ اس سلسلہ میں گھر کے قیمتی سامان رہن رکھ دئے گئے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہمارا وہ رہائشی بنگلہ بھی فروخت ہو گیا۔ سب کے آخر میں میرے زیورات کا نمبر آ گیا اور باری باری وہ بھی فروخت ہو گئے۔ چنانچہ میرے آخری زیور کو بکے ہوئے اس وقت ایک سال گذر چکا ہے۔

خدا جزائے خیر دے میرے ماموں صاحب کو جو وقتاً فوقتاً ہماری خبر گیری کو آ جاتے اور تھوڑی بہت ہماری مدد کر جاتے ورنہ ہم لوگ تو فاقوں ہی سے مر گئے ہوتے۔

یہ ہے مجھ بدنصیب کی سرگذشت۔ اب مجھے آپ سے کہنا یہ ہے کہ آپ خالد کے دوست ہیں مجھے یقین ہے کہ خالد کے حالات کو آپ ضرور سُدھار دیں گے۔ اگر آپ نے یہ کام انجام دے دیا تو میں اور میرے یہ معصوم بچے آپ کا احسان عمر بھر نہ بھولیں گے۔"

یہ کہہ کر بیگم خالد سلام کرتی ہوئی اندر چلی گئیں اور میں سخت حیرانی و پریشانی میں مبتلا ہو گیا۔ اس قدر بگڑے ہوئے آدمی کو سدھارنا بھی مجھے دشوار نظر آ رہا تھا اور اُس کے نہ سُدھرنے کی صورت میں

اس کے گھر بھر کی بربادی بھی یقینی دکھائی دیتی تھی۔

بیگم خالد کے چلے جانے کے بعد میں نے اسلم سے پوچھا کہ میں تمھارے والد سے کس وقت ملاقات کر سکتا ہوں؟

دروازہ کے پیچھے سے بیگم خالد نے کہا۔ آپ صبح کو ناشتہ کے وقت تشریف لائیں اور ناشتہ ہمارے یہاں فرمائیں۔

خالد سے ملاقات کا وقت معلوم کر کے میں ڈاک بنگلہ چلا گیا اور بڑی بے چینی سے میں نے وہ رات گذاری۔

صبح ہوتے ہی میں سیدھے خالد منزل پہنچا۔ جہاں ایک ایسا شخص میرا انتظار کر رہا تھا جس کو میں خالد کا آسیب یا ہمزاد تو سمجھ سکتا تھا لیکن اس کو خالد یقین کرنا میرے لئے سخت دشوار تھا لیکن خالد نے مجھ کو پہچان لیا اور مسرت و ندامت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ وہ اُٹھا اور مجھ سے بغلگیر ہو گیا۔ ابھی ہم ایک دوسرے کی مزاج پُرسی سے فارغ بھی نہ ہو پائے تھے کہ خالد کا بچہ اسلم ہمارے لئے ناشتہ لے کر آ گیا۔

ناشتہ سے فرصت پانے کے بعد میں نے خالد سے اس کی اس حیرتناک تبدیلی پر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"دوست خالد! میری سمجھ اس وقت صحیح کام نہیں کر رہی ہے۔ اور میرے لئے یہ فیصلہ دشوار ہے کہ تم سے اپنے لئے کوئی نصیحت چاہوں جس طرح آج سے آٹھ دس سال قبل میں برابر تم سے نصیحت لیا کرتا تھا یا اُلٹا میں تم کو نصیحت کروں جیسا کہ تمھارے موجودہ احوال کو دیکھ کر مجھے اپنا اخلاقی فرض محسوس ہو رہا ہے۔ اور پھر اگر تم کو نصیحت کروں بھی تو کیا نصیحت کروں۔ کون سی بات ایسی ہے جو تم کو نہ معلوم ہو اور مجھے معلوم ہو۔ میں تو سخت حیران ہوں کہ تم سے کچھ کہوں تو کیسے کہوں اور کروں تو کیا کروں؟ مگر ہمارے تمھارے تعلقات بھی ایسے نہیں کہ میں تمھاری یہ حالت دیکھ کر خاموش رہ جاؤں اس لئے مجھے تم سے بہرحال کہنا ہے اور اس کی پوری کوشش کرنا ہے کہ تم اپنی موجودہ حالت پر غور کرو اور اسکو چھوڑ کر اپنی پچھلی حالت کی طرف لوٹ آؤ۔ اچھا اب سنو!

خالد! تم نے اپنی زندگی کا جو طریقہ اس وقت اپنا رکھا ہے یہ طریق حیات نہیں ہے بلکہ دراصل یہ تو زندگی سے فرار ہے۔ یہ ایک حسّاس آدمی کی موت ہے۔ عقل کی موت ہے۔ یہ راہ فرار وہ لوگ اختیار کیا کرتے ہیں جن میں کسی کام کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ وہ اپنے نکمے پن کو چھپانے کے لئے اسکو اپنا لیتے ہیں۔

"تم جس راستہ پر چل رہے ہو یہ تم کو سیدھا قبر تک پہنچانے والا راستہ ہے جسے کوئی خودکشی کرنے والا ہی اختیار کرتا ہے اور اگر تم خودکشی پر ہی آمادہ ہو تو اس کے لئے بھی زہر کا استعمال زیادہ بہتر ہوگا تاکہ قصہ جلد ہی ختم ہو جائے اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے سے تم بچ جاؤ۔

"میرے دوست آخر تم کو ایسی کیا مجبوری تھی جس کی وجہ سے تم نے زندوں کی زندگی گزارنے کے مقابلہ میں اس مُردہ زندگی کو پسند کیا"۔

"میرے اچھے دوست آؤ آج ہم تم عہد کریں کہ ہم پھر اسی طرح نیک دوست اور بہترین ساتھی بن کے رہیں گے جیسے اب سے چند سال پہلے رہا کرتے تھے"۔

یہ سب باتیں کہہ کر میں نے اپنا ہاتھ اُس کی طرف بڑھا دیا کہ وہ بھی اسی طرح اپنا ہاتھ بڑھا دے اور ہم میں یہ عہد استوار ہو جائے۔

مگر مجھے سخت حیرت اور بیحد مایوسی ہوئی جب میں نے دیکھا کہ میرے جواب میں اس کے ہاتھوں میں ذرا بھی جُنبش نہ ہوئی اور وہ بدستور چُپ چاپ بیٹھا رہ گیا۔ آخر میں نے پوچھا۔

"خالد! تم نے میری بات سُن کر عہد کرنے کے لئے اپنا ہاتھ کیوں نہیں بڑھایا"؟

اس کے جواب میں وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور اس نے وہی بات کہی جو ایسے موقع پر عموماً ایسے لوگ کہا کرتے ہیں۔

"میں وعدہ خلافی کو پسند نہیں کرتا ہوں"۔ وہ بولا۔

تم کو وعدہ خلافی کے لئے کیا چیز مجبور کر رہی ہے؟" میں نے سوال کیا۔

وہ بولا" میں ایک بدبخت اور بدنصیب آدمی ہوں جس کو خوش نصیبی سے کوئی سروکار نہیں ہے"۔

میں نے کہا" جب تم ایسے کردار کو اختیار کر کے بدنصیب بن سکتے ہو تو اچھے کام کر کے خوش نصیب بھی تو ہو سکتے ہو"۔

میں سمجھ رہا تھا کہ میری اِس بات پر وہ لاجواب ہو کر خاموشی اختیار کرے گا مگر ایسا نہ ہوا۔ اس نے پھر جواب میں کہا۔

میں بدنصیب تو بن سکتا ہوں مگر خوش نصیب نہیں ہو سکتا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ خوش نصیبی آسمان جیسی بلند چیز ہے اور بدنصیبی ذلت کا گہرا غار ہے۔ اوپر چڑھنے کے مقابلہ میں نیچے اُترنا یقیناً آسان ہے اور اب جب کہ میرا قدم کنارہ پر پھسل چکا ہے تو اب درمیان میں رُکنے کی

کوئی صورت باقی نہیں ہے۔

اسی طرح کچھ دیر تک مجھ کو برابر جواب دیتا رہا پھر میری باتوں سے عاجز آکر وہ اُسی حال میں اُٹھ کھڑا ہوا اُس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں اور مجھ سے کچھ کہے بغیر سر کو جھٹکتا ہوا باہر چلا گیا۔

کچھ دنوں بعد مجھ کو معلوم ہوا کہ خالد کے سکشن انچارج نے اُس کے نکمے پن کی رپورٹ کردی اور اُس کو ملازمت سے برطرف کرا دیا ہے اور اب خالد انتہائی تنگدستی اور مصیبت کے دن گذار رہا ہے۔

میں دفتر سے اپنے مکان کو جا رہا تھا کہ راستہ میں ایک جگہ میری نظر ایک پریشان حال نوخیز لڑکے پر مرکوز ہو کر رہ گئی جو گردشِ زمانہ کی مجسّم تصویر بنا ہوا تھا۔ یہ لڑکا اسلم تھا میرے دوست خالد کا چہیتا بیٹا۔

اسلم کو میں نے اپنے ساتھ لے لیا اور راستہ میں اُس کے گھر کے حالات دریافت کرنے شروع کر دیئے۔ اسلم نے مجھ کو بتایا کہ آپ کی ملاقات کے بعد والد صاحب میں تو کوئی تبدیلی نہ آئی مگر ہم لوگوں پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ مجھ کو آپ کا پتہ بھی معلوم نہ تھا کہ آپ کو حالات کی اطلاع دیتا۔

ہوا یہ کہ سب سے پہلے تو مالک مکان نے کرایہ نہ ملنے کی وجہ سے ہم لوگوں کو اپنے مکان سے علیحدہ کر دیا اور مجبوراً ہمیں ایک کھنڈر میں سر چھپانے کے لئے جگہ بنانی پڑی۔ ابھی کھنڈر میں گئے ہوئے ہم کو چند ہی مہینے گذرے ہوں گے کہ امی کی طبیعت خراب رہنے لگی اور وہ اسپتال میں بھرتی ہوگئیں جہاں کچھ دنوں کے بعد ہماری ایک بہن پیدا ہوئی۔ ہماری مفلسی کی وجہ سے اسپتال والوں نے بھی بہت جلد امی کو وہاں سے رخصت کر دیا اور وہ پھر اسی کھنڈر میں آگئیں مگر اس حالت میں کمزوری بیحد تھی۔ دو قدم چلنا بھی ان کو دشوار تھا۔ اُن کو ہر وقت بخار رہنے لگا۔

میں محلہ کے ایک ہوٹل میں کام کرتا اور جو پیسے ملتے ان سے ان کی دوا وغیرہ لاتا۔ والد صاحب اپنی عادت کے مطابق وقت بے وقت گھر آتے جاتے اور امی کے پاس اگر کچھ پیسے ہوتے تو اپنی شراب کے لئے چھین لے جاتے اور وہ کچھ اپنی کمزوری کے باعث پیسوں کو ان سے چھپا کر رکھ بھی نہ سکتیں۔ پھر ایک دن امی کو نمونیہ ہوگیا۔

اور وہ گھر میں اکیلی پڑی پڑی ختم ہوگئیں۔ مرتے وقت ان کو کوئی بُوند بھر پانی دینے والا بھی نہ تھا۔ میری چھوٹی بہن ان کے سینہ سے چمٹی ہوئی شاید دودھ پی رہی تھی جب انھوں نے دم توڑا ہے۔

یہاں تک اسلم کہہ سکا تھا کہ اُس کی قوت ضبط نے جواب دے دیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر
رونے لگا۔ حالات ایسے رقت انگیز تھے کہ میرا پیمانۂ صبر بھی لبریز ہوگیا مگر میں نے بہت ضبط سے کام
لیا اور اسلم کو تسلی دینے لگا۔ اس نے کہا ابھی میری دُکھ بھری کہانی ختم نہیں ہوئی آگے بھی سنئے۔
غالباً اسی حالت میں جب میری امی مردہ پڑی تھیں اور بچّی ان کے سینہ کے پاس پڑی
دودھ کے لئے رو رہی تھی کہ والد صاحب گھر میں آگئے اور یہ سمجھ کر کہ والدہ سو رہی ہیں۔ بچّی کو
اُٹھا کر الگ ڈال دیا اور امی کو جھنجھوڑنا شروع کر دیا۔ پھر ذرا دیر بعد شاید ان کو صورت حال کا
کچھ اندازہ ہوا اور وہ گھبرا کر پیچھے پلٹے۔ وہ اپنے آپے میں تو تھے نہیں۔ پیچھے پلٹتے ہی ان کا پاؤں
چھوٹی بہن کے سینہ پر پڑ گیا اور ایک ہلکی سی چیخ کے بعد وہ بھی امی کی آغوش میں سونے کے لئے
پہونچ گئی اور مجھ کو اکیلا چھوڑ گئی۔

مزمل رضا

چند سال پہلے کا ذکر ہے۔ ایک جرمن خاتون امریکہ کی سیاحت کر رہی تھی۔ خرید و فروخت کی غرض سے اُسے ایک دُکان میں جانے کا اتفاق ہوا۔ مطلوبہ چیزیں خرید کر اُس نے قیمت ادا کی اور بنڈل اُٹھا کر باہر نکلنے ہی والی تھی کہ دکاندار ایک چھوٹا سا خوبصورت پیکٹ کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے بولا۔

"محترمہ، یہ بھی لیتی جائیے۔"

خاتون نے مُڑ کر دیکھا۔ ایک پیکٹ میں گتے کی بنی ہوئی پانچ ماچسیں رکھی تھیں۔

"شکریہ، مجھے ماچسیں نہیں چاہئیں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"رکھ لیجئے، ان کی قیمت ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔"

دکاندار کی بات سُن کر خاتون کچھ حیران سی رہ گئی۔ جرمنی میں پانچ ماچسوں کی قیمت تقریباً تین امریکی سینٹ تھی، لیکن یہاں یہ مفت مل رہی تھیں۔

ریاستہائے متحدہ امریکہ دنیا کا غالباً واحد ملک ہے جہاں ماچسیں مفت ملتی ہیں۔ تمباکو، سگریٹ اور ادویات بیچنے والے، ہوٹلوں کے کیشیئر، کاروباری ایجنسیوں کے میزبان، کلرک، آپ کو بلامعاوضہ ماچسیں پیش کریں گے۔ ایک اندازے کے مطابق امریکہ میں ہر سال .... ۱۲۵ ماچسیں مفت تقسیم کی جاتی ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا کہ آخر یہ ماچسیں کہاں سے آتی ہیں۔ دراصل کاغذی ماچس چلتے پھرتے اشتہار ہیں جو مختلف کمپنیاں اپنی اپنی مصنوعات کو عوام میں زیادہ سے زیادہ پھیلانے کے لئے تقسیم

کرتی ہیں۔ دھوبی دُھلے ہوئے کپڑوں کے پیکٹ میں ایک ماچس رکھ دے گا جس پر اُسکی دکان کا نام اور پتا چھپا ہوا ہے۔ جنرل سٹور والا آپ کو سامان بھجوائے گا، تو ساتھ میں ایک ماچس بھی ہو گی۔ اس ماچس پر اس کی دکان کا اشتہار ہو گا۔ چھوٹے چھوٹے کاروباری اداروں سے لیکر بڑے کارخانوں تک، ہر تنظیم اپنے لئے زیادہ سے زیادہ تعداد میں کاغذی ماچسیں بنواتی ہے اور عوام میں مفت تقسیم کرتی ہے۔ نیویارک کے ہر شہری کو اکثر و بیشتر ڈاک کے ذریعہ ماچسیں ملتی رہتی ہیں۔ کاروباری ادارے ہر ممکن طریق سے لوگوں کے پتے جمع کرتے ہیں اور ماچسوں کی صورت میں اپنے اشتہار بھیج دیتے ہیں۔ بچوں کی پیدائش پر ہر شخص کو بچے کا نام وغیرہ درج کروانا پڑتا ہے۔ بچوں کے لئے ادویات اور دوسرا سامان تیار کرنے والی کمپنیاں یہ پتے حاصل کر لیتی ہیں اور شادی شدہ جوڑوں کو ڈاک کے ذریعے "مبارکباد کی ماچسیں" بھیجتی ہیں۔ ان کاغذی ماچسوں پر مبارکباد کا مضمون پہلے سے چھپوا لیا جاتا ہے۔

بعض کاروباری ادارے ماچسوں پر صرف اشتہار ہی نہیں دیتے، بلکہ اپنی تیار کردہ کسی خاص چیز کا نمونہ بھی ساتھ شامل کر دیتے ہیں۔ گلٹ بلیڈ فیکٹری نے ایسی پچاس کروڑ ماچسیں تقسیم کی تھیں جن میں نمونے کا ایک ایک بلیڈ رکھا گیا تھا۔ نتائج خاطر خواہ برآمد ہوئے اور صرف چند ہفتوں میں گلٹ بلیڈ عوام و خواص تک پہنچ گیا۔ بلیڈ کے علاوہ بعض دوسری فیکٹریاں بھی ماچسوں میں نمونے کی چیزیں شامل کر دیتی ہیں۔ مثال کے طور پر سردرد، بخار اور کھانسی کی گولیاں، کاغذی ماچس کے ساتھ چپکا دی جاتی ہیں۔ چیونگ گم والا گوند، میٹھی ٹکیاں اور ٹافیاں تیار کرنے والے بھی اپنی اپنی چیزیں کاغذ کی خوبصورت پیکنگ میں ماچسوں کے ساتھ لگا دیتے ہیں۔ پچھلے دنوں عطر تیار کرنے والی ایک فرم نے ایک لاکھ کاغذی ماچسیں مفت تقسیم کیں جن کا بیرونی کاغذ خوشبو میں بسا ہوا تھا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد بعض لوگوں نے انفرادی طور پر کاغذی ماچسوں کو اپنی مطلب برآری کے لئے استعمال کیا۔ یہ لوگ ماچسوں پر اپنی تکلیفیں اور حاجتیں مضمون کی صورت میں چھپواتے اور انھیں گلیوں اور بازاروں میں تقسیم کر دیتے۔ مخیر لوگ ماچس پر لکھے ہوئے پتے پر امدادی رقوم بھیج دیتے۔

خیال ہے کہ امریکہ کی تقریباً اڑھائی لاکھ فرمیں ہر سال کاغذی ماچسوں کی تیاری پر دو کروڑ ساٹھ لاکھ ڈالر خرچ کرتی ہیں۔ ماہرین صنعت و تجارت کا اندازہ ہے کہ یہ رقم کئی گنا زیادہ فائدہ پہنچاتی ہے۔ ہر ماچس میں کاغذ کی بیس دیا سلائیاں ہوتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہر ماچس کو کم و بیش بیس مرتبہ استعمال کیا جاتا ہے۔ معمولی سی رقم کے عوض اگر کوئی شخص آپ کا اشتہار بیس مرتبہ پڑھ لے تو یہ سودا ہر گز مہنگا نہیں۔ ایک اندازے کے مطابق ایک ہزار اشتہاری ماچسوں میں سے صرف ایک ماچس استعمال کے بغیر پھینکی جاتی ہے، باقی ۹۹۹ ماچسیں باقاعدہ استعمال میں آتی ہیں۔ آیئے ہم اس صنعت کا شروع سے جائزہ لیں۔

آج سے ۷۰ سال پہلے فلاڈلفیا میں جوشوا پوسے نامی ایک وکیل رہتا تھا۔ پوسے بہت نازک طبع انسان تھا۔ اس دور میں لکڑی کی بنی ہوئی ماچسوں کا رواج زیادہ تھا جیسا کہ آج کل ہمارے ہاں ہے۔ یہ ماچسیں جسامت میں موجودہ ماچسوں سے بڑی تھیں اور جیب میں رکھنے سے اچھا خاصا بوجھ اٹھانا پڑتا تھا۔ ایک روز یوں ہی بیٹھے بیٹھے اسے خیال آیا کہ کاغذ لکڑی سے کم جگہ لیتا ہے اور زیادہ تیزی سے جلتا ہے۔ آخر لوگ کاغذ کی دیا سلائیاں کیوں استعمال نہیں کرتے۔ تھوڑی کی کوشش کرنے پر وہ ماچس فیکٹری سے مسالا حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا جو عام دیا سلائی کے کنارے پر لگایا جاتا ہے۔ قینچی کی مدد سے اس نے کارڈ بورڈ سے پچاس چفتیاں کاٹیں اور انھیں مسالے میں ڈبویا۔ تجربہ کامیاب رہا۔ ۲۶ ستمبر ۱۸۹۲ء کو اس نے یہ اچھوتا خیال واشنگٹن انڈسٹریز ایکٹ کے تحت پیٹنٹ کرا لیا۔ ڈائمنڈ میچ وہ پہلی فیکٹری تھی جس نے پوسے کی ایجاد کو دس ہزار ڈالر میں خرید لیا۔

۱۸۹۴ء میں ڈائمنڈ انڈسٹری نے کاغذی ماچسیں بنانا شروع کیں۔ یہ دیکھ کر کمپنی کے کارپرداز حیران رہ گئے کہ لوگ لکڑی کی بنی ہوئی ماچسوں کے بجائے کاغذی ماچسیں خریدنے کے لئے ہرگز تیار نہ تھے۔ ان ماچسوں کو عوام میں روشناس کرانے کا سہرا ایک کاروباری ایجنٹ ہنری ٹراٹ کے سر ہے۔ ہنری ایک اٹھائیس سالہ نوجوان تھا اور سارے علاقے کا مشہور و معروف سیلزمین تھا۔ ڈائمنڈ انڈسٹری نے اس کی خدمات حاصل کیں۔ ہنری ٹراٹ نے حتی المقدور کوشش کی، لیکن دکاندار کاغذی ماچسیں خریدنے پر تیار نہ تھے۔ اس نے پرانے تعلقات کا واسطہ دیا، دلائل سے قائل کرنا چاہا، طرح طرح کے سبز باغ دکھائے، زیادہ کمیشن کا لالچ دیا۔ مگر کامیابی نہ ہوئی۔ ڈائمنڈ اسٹری سے معاہدہ کئے اسے پندرہ دن سے زائد ہو چکے تھے لیکن ابھی تک وہ ایک ماچس بھی فروخت نہیں کر سکا تھا۔ وہ بہت افسردہ اور پریشان حال تھا۔ ایک شام ڈراما دیکھنے کی غرض سے وہ میںڈرس اوپرا کمپنی چلا گیا۔ ٹکٹ خریدنے والوں کی لمبی قطاریں لگی تھیں، وہ بھی ایک قطار میں کھڑا ہو گیا۔ اگلے ڈرامے کے اشتہار تقسیم کئے جا رہے تھے۔ گرمی بہت تھی۔ ٹراٹ کے ساتھ کھڑے ہوئے ایک شخص نے اشتہار کے کاغذ کو

دوہرایا اور پنکھا کرنے لگا۔ پہلے کوئی شخص ان اشتہاروں پر توجہ دینے کے لیے تیار نہ تھا، لیکن دیکھتے ہی دیکھتے بیسیوں لوگ اشتہاروں کو دستی پنکھے کے طور پر استعمال کرنے لگے۔ ایک خیال بجلی کی طرح ٹراٹ کے ذہن میں آیا۔ وہ ڈراما دیکھے بغیر بھاگم بھاگ ڈائمنڈ کمپنی کے دفتر پہنچا۔ میز پر مختلف اخبار اور رسائل بکھرے پڑے تھے۔ اس نے جلد جلد ایک اخبار کی ورق گردانی کی اور بالآخر اسے مطلوبہ شے مل گئی۔ یہ چٹنی تیار کرنے والی ایک فیکٹری کا اشتہار تھا۔

"یہ اشتہار ماچس کے بیرونی کاغذ پر شائع کردو۔" اس نے اشتہار کاٹتے ہوئے منیجر سے کہا۔

اگلے روز اسے ماچسوں کا ایک پیکٹ مل گیا جن پر ہنکس چٹنی کا اشتہار تھا۔ وہ فوراً ہی ہنکس فیکٹری پہنچا۔ فیکٹری کے مینیجنگ ڈائرکٹر سے ملنے میں اسے کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ ماچسوں کا پیکٹ میز پر رکھتے ہوئے اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔

"دیکھئے صاحب، آپ اخبار میں اشتہار دیتے ہیں۔ اخبار زیادہ سے زیادہ لوگ ایک دفعہ پڑھتے ہیں اور ہر شام ردی کی ٹوکری میں پھینک دیتے ہیں۔ اگر آپ یہی اشتہار کاغذی ماچسوں پر چھپوائیں اور یہ ماچسیں مفت تقسیم کریں، تو ہر شخص انھیں خوشی خوشی لے گا، ایک ماچس میں بیس دیا سلائیاں ہیں یعنی کم ازکم بیس مرتبہ ہر آدمی آپ کا اشتہار پڑھنے پر مجبور ہوگا۔"

خاصی بحث وتمحیص کے بعد ٹراٹ کامیاب ہوگیا۔ اسے بیس ہزار ماچسوں کا آرڈر مل گیا تھا۔ اگلے ایک ہفتے میں اسے تمباکو تیار کرنے والی تین فرموں سے کوئی تین کروڑ ماچسوں کے آرڈر ملے۔ ڈائمنڈ کمپنی نے نئی مشینری خریدی جس کی مدد سے ایک گھنٹے میں ایک ہزار ماچسیں تیار ہوتی تھیں۔ آہستہ آہستہ یہ کاروبار بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ ٹراٹ کو نمونے کی ماچسیں تھیلے میں رکھ کر سڑکوں کے چکر کاٹنے کی ضرورت نہ رہی۔ اب اسے گھر بیٹھے روزانہ بیسیوں آرڈر مل جاتے تھے۔

آج کل صرف امریکہ میں بارہ لاکھ سے زائد افراد مشغلے کے طور پر کاغذی ماچسوں کے بیرونی لیبل جمع کرتے ہیں۔ ڈاک کے ٹکٹوں کے بعد یہ عوام کا دوسرا محبوب ترین مشغلہ ہے۔ پہلی کاغذی ماچس کا لیبل آج تک موجود ہے۔ یہ بہت خستہ حالت میں ہے۔ ۱۸۹۵ء میں شائع شدہ اس لیبل کی صرف ایک کاپی بنک میں محفوظ ہے۔ یہ لیبل جس کمپنی کی ملکیت ہے، اس نے یہ ماچس ۲۵ ہزار ڈالر میں خریدی تھی۔

سائنس کی ترقی کے ساتھ ساتھ بہتر مشینری بھی معرضِ وجود میں آئی ہے! چنانچہ آج کل ماچس کی فیکٹریاں ایک گھنٹے میں اوسطاً اسی ہزار ماچسیں تیار کرتی ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق امریکہ میں ہر شخص سال میں تین ہزار ماچسیں استعمال کرتا ہے جن میں سے اسی فی صد مفت ملتی ہیں۔ (اردو کے ایک ڈائجسٹ سے ماخوذ)

کینتھ اینڈرسن

شیر کی جنگ
اصلی اور نقلی

(ترجمہ محمد ظفیر ندوی)

یہ داستان اتنی حیرت انگیز ہے کہ آپ اس پر یقین نہیں کریں گے لیکن اس کا کیا جائے کہ بعض حقائق اپنے اندر افسانے کی سی رعنائی رکھتے ہیں۔ میں ان دنوں میں ہندوستان میں تھا اور جس گاؤں کا ذکر کرنے لگا ہوں اس کے قریب ہی سرکاری عہدے پر مامور تھا۔ نیل گری کی پہاڑیوں کے دامن میں یہ گاؤں آباد ہے۔ اس کے چاروں طرف کیلوں کے پیڑ پھیلے ہوئے ہیں۔ ان باغات کی وجہ سے یہ گاؤں دور دور تک مشہور ہے اور شائقین اڈے چلے آتے ہیں۔

گاؤں سے دس میل دور کانتھا کی جھونپڑی تھی، وہ کیلے اگاتا اور انہیں شہر میں بیچ کر گزارا کرتا تھا۔ یہی اس کی ساری کائنات تھی۔ ایک روز شام ڈھلے کانتھا ایک کیلے کے درخت میں پانی دے رہا تھا کہ ایک سادھو نے خاص انداز میں صدا دی اور جھونپڑی میں دو راتیں بسر کرنے کی اجازت مانگی۔ کانتھا خوش عقیدہ ہندو تھا۔ اس نے سوچا، سادھو کی آمد سے ممکن ہے کیلوں کی فصل اچھی ہو۔ وہ اسے اپنی جھونپڑی میں لے آیا۔ تازہ کیلوں اور تازہ مکھن سے اس کی تواضع کی۔ جب اس نے سنا کہ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ گاؤں گاؤں لوگوں کو آشیرباد دینے کے لئے پیدل چل رہا ہے تو وہ فرط محبت سے جھوم اٹھا۔ اس نے اس کے پاؤں دباتے ہوئے کہا:

"سوامی جی، آپ میرے پاس دو ہفتے ٹھہریں اور خدمت کا موقع دیں اور میرے لئے دعا کریں۔ یہ باغ پھل کم دینے لگا ہے۔ آپ کی دیا سے بہار آجائے گی۔"

سادھو نے اتنے میٹھے اور لذیذ کیلے پہلی بار کھائے تھے۔ اور تازہ مکھن نے تو سونے پر سہاگے کا کام کیا تھا۔ اس نے کانتھا کی دعوت قبول کر لی

دو ہفتے کے بجائے دو مہینے بیت گئے۔ سادھو وہیں جم گیا۔ تازہ کیلوں اور تازہ مکھن

کی چاٹ ایسی لگی تھی کہ وہ نگر نگر گھومنا بھول گیا۔ کانتھا نے جب دبے لفظوں میں سادھو کو اس کا مشن یاد دلایا، تو اس نے غصّے سے پیچ و تاب کھاتے ہوئے کہا

"میری ذرا سی بد دعا اس باغ کو بھسم کر ڈالے گی۔"

کانتھا کانپ اٹھا اور اس کے قدموں میں جھک گیا۔ سادھو نے تحکمانہ لہجے میں حکم دیا۔ اپنے باغ کے کنارے میرے لئے ایک الگ جھونپڑی بنا دو، میں وہیں رہا کروں گا۔ مجھے ہر روز کیلے اور مکھن پہنچا دیا کرنا۔" کانتھا نے سرِ تسلیم خم کر دیا۔

سادھو شام کا کھانا کھانے کے بعد بانسوں اور گھاس پھوس کی بنی ہوئی جھونپڑی میں چلا جاتا اور پھر بالکل باہر نہ آتا۔ اندر دیئے کی لو ٹمٹماتی رہتی اور بعض اوقات ساری رات جلتی رہتی۔ کیلے کے باغوں میں کام کرنے والے مزدور حیران تھے کہ دیا رات بھر کیوں جلتا ہے اور سادھو اس دیئے کی روشنی میں کیا کرتا ہے۔ ایک رات ایک مزدور چپکے سے جھونپڑی کے قریب گیا اور اس نے بانسوں کی ریخوں سے جھانک کر دیکھا۔ سادھو اندر نہیں تھا۔ وہ دروازہ کھول کر اندر چلا گیا بستر بچھا ہوا تھا، لیکن سادھو غائب تھا۔

مزدور نے ساتھیوں کو سارا واقعہ سنایا۔ وہ سب تاک میں بیٹھ گئے کہ دیکھیں سادھو کب آتا ہے۔ ابھی چند منٹ ہی گذرے تھے کہ شیر کے دھاڑنے کی آواز آئی۔ پورا جنگل گونج اٹھا۔ مزدور خوف و دہشت کے مارے وہیں دبک گئے۔ شیر پھر گرجا۔ یہ آواز سادھو کی جھونپڑی کے بالکل قریب سے آرہی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ شیر کیلوں کے باغ کے نزدیک گرج رہا تھا۔ پندرہ بیس میل اُدھر شیر جنگل میں گھوما کرتے تھے۔ لیکن اس طرف کبھی کوئی شیر نہیں آیا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا۔ وہ دم سادھے آہستہ آہستہ اپنی اپنی جھونپڑیوں میں چلے گئے۔ ان کی راتوں کی نیند حرام ہو گئی۔ صبح ہوتے ہی وہ سیدھے سادھو کی جھونپڑی میں گئے۔ شیر کے پاؤں کے نشانات جھونپڑی سے دور جنگل تک چلے گئے تھے، لیکن سادھو اپنی جھونپڑی میں کیلے اور مکھن کھا رہا تھا۔

ان دنوں وہاں مزدور کام کر رہے تھے۔ جنگل کو صاف کر کے نئے درخت لگائے جا رہے تھے۔ بھینسوں اور گایوں کو چرانے کے لئے لوگ شہر سے آئے ہوئے تھے۔ اس جنگل میں شیر کی آمد نے سب کو خوف زدہ کر دیا۔ وہ رات کو باڑوں کے گرد بڑے بڑے الاؤ روشن کرتے اور دن کو بھی بہت محتاط ہو کر چلتے پھرتے۔ شیر ہر رات سادھو کی جھونپڑی کے قریب سے گرجتا ہوا ..... جنگل میں گم ہو جاتا، لیکن اب تک کسی کو گزند نہیں پہنچا تھا۔

ایک ہفتہ یوں ہی گزر گیا۔ شیر ہر رات دھاڑتا اور پھر دور جنگل میں گم ہو جاتا۔ اب تک اُسے کسی نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ لوگوں نے جانوروں کے باڑوں کے گرد موٹی لکڑی اور اینٹوں کی دس دس فٹ اونچی دیوار کھڑی کر لی اور راتوں کو اطمینان سے سونے لگے۔

ایک روز علی الصباح گڈریا جانو چیختا ہوا آیا۔ رات کو شیر اُس کی خوبصورت گائے اُٹھا کر لے گیا تھا۔ دیوار ایک طرف سے کچھ کم اُونچی تھی۔ شیر نے اُسی جانب سے جست لگائی، گائے کو منہ میں لیا اور اُسی طرف سے واپس چلا گیا۔ گائے کے خون کے بڑے بڑے قطرے فرلانگ تک چلے گئے تھے۔ شیر نے جس جگہ اپنا شکار رکھا تھا، وہ سادھو کی جھونپڑی سے بمشکل ڈیڑھ دو سو گز دور ہو گی۔ پھر ہر رات ایک جانور غائب ہونے لگا۔ شیر کسی نہ کسی طرح باڑے سے اپنا شکار حاصل کر لیتا۔ کبھی خون پی کر مردہ جسم وہیں چھوڑ جاتا اور کبھی جانور کو دور تک گھسیٹتے ہوئے لے جاتا۔
ان واقعات سے ہر طرف دہشت پھیل گئی۔ لوگ رات رات بھر جاگتے، الاؤ روشن کرتے، پہرہ دیتے، لیکن شیر خاموشی سے رات کی تاریکی میں کسی نہ کسی گائے، بھینس یا بکری کو اڑا کر لے جاتا۔
یہ عجیب بات تھی کہ یہ شیر نہ تو دن کو دھاڑتا اور نہ چاندنی رات میں کسی کو نظر آتا تھا۔ لوگوں کو ڈر تھا کہ اگر اُسے کسی انسان کا خون منہ لگ گیا تو معلوم نہیں کیا آفت آئے گی۔ اُدھر لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگی کہ شیر سادھو کو کوئی نقصان کیوں نہیں پہنچاتا۔ کوئی کہتا کہ سادھو اپنی روحانی طاقت کے بل پر اُس شیر کا دوست بن گیا ہے اور کوئی کہتا کہ سادھو ہی رات کو شیر بن کر جانوروں پر حملہ کرتا ہے۔ ان افواہوں نے ایک طرف تو لوگوں کے دلوں میں سادھو کا خوف پیدا کر دیا اور دوسری طرف وہ اُسے پوجنے کی حد تک عقیدت کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔
اتفاق کی بات ہے کہ انہی دنوں ایک جنگلی ہاتھی نے بھی تباہی مچانی شروع کر دی۔ وہ کیلے کے باغوں کو اجاڑنے لگا۔ دن دیکھتا نہ رات، باغ میں گھس آتا اور کیلے کے پیڑوں کو تہس نہس کرتا ہوا گزر جاتا۔ کانتھا کا باغ بھی اُس کے دستبرد سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اُس کے پاس ایک چھوٹی سی بندوق تھی جو ہاتھی کو ہلاک تو نہیں کر سکتی تھی، لیکن اُسے ڈرانے کے لئے استعمال کیا جا سکتا تھا۔ ایک رات وہ ایک اونچے درخت پر جا بیٹھا، اُس کا ارادہ ہاتھی پر فائر کرنے کا تھا۔ چاندنی رات میں وہ درخت پر بیٹھا بیٹھا تھک گیا۔ اچانک اُس نے شیر کے دھاڑنے کی آواز سنی وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اُس نے غور سے دیکھا، سادھو کی جھونپڑی کے قریب شیر کی انگارے کی طرح آنکھیں چمک رہی تھیں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ انسان نے اس شیر کو دیکھا تھا۔ کانتھا کے دل میں خیال آیا کہ وہ کیوں نہ بندوق چلا دے، ممکن ہے کہ شیر زخمی ہو کر ہمیشہ کے لئے اپاہج ہو جائے۔ اُسے یقین تھا کہ اگر نشانہ خطا بھی گیا، تو پھر بھی اُسے کوئی نقصان نہ پہنچے گا، کیونکہ وہ بلند مقام پر بیٹھا تھا۔ یہ خیال آتے ہی اُس نے لبلبی پر انگلی رکھ دی، نشانہ لیا، اور بندوق چلا دی۔ بندوق کی آواز کے ساتھ ہی شیر دھاڑا اور گرجتا ہو جنگل میں غائب ہو گیا۔
اگلے روز کانتھا کا نوجوان بیٹا جب کیلے اور مکھن لے کر سادھو کی جھونپڑی میں گیا،

توخلاف معمول دروازہ بند تھا۔ اس نے آواز دی تو اندر سے جواب آیا: "میں بیمار ہوں اس لئے کچھ نہیں کھاؤں پیوں گا۔"

لڑکے کی نظر اچانک جھونپڑی کی دہلیز پر پڑی۔ خون کے بہت سے قطرے زمین میں جذب ہو کر زرد ہو گئے تھے۔ دروازے پر بھی خون کے نشان تھے۔ لڑکے نے خیال کیا کہ شاید سادھو زخمی ہو گیا ہے۔ اس نے باہر سے ہی آواز دی:

"سوامی جی کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتایئے۔"

سادھو زور سے چیخا:

"یہاں سے فوراً چلے جاؤ، مجھے تمہاری کسی چیز کی ضرورت نہیں۔"

لڑکے نے جب کانتھا کو یہ واقعہ سنایا تو ایک لمحے کے لئے وہ سکتے میں آگیا۔ اس کے دماغ میں وہ تمام افواہیں گشت کرنے لگیں جو سادھو کے بارے میں مشہور تھیں۔ رات اس نے شیر پر جو بندوق چلائی تھی کہیں اسی سے سادھو زخمی تو نہیں ہو گیا! شاید سادھو اس وقت شیر کے روپ میں تھا۔ وہ چپکے سے اٹھا اور سادھو کی جھونپڑی کی جانب چل دیا۔ جھونپڑی اب بھی بند تھی۔ دروازے اور دہلیز پر خون کے چھینٹے بدستور موجود تھے۔ وہ گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا۔ اور زمین پر لیٹ کر ریخوں میں سے اندر جھانکنے لگا۔ اچانک اسے اپنے سر پر شیر کے غرانے کی آواز سنائی دی۔ وہ بوکھلا کر اٹھ بیٹھا۔ سادھو غصہ سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کا دایاں ہاتھ اور بازو کا بالائی حصہ کپڑے سے بندھا ہوا تھا۔ خون سرایت کر جانے کی وجہ سے کپڑا سرخ اور سخت ہو گیا تھا۔

کانتھا نے سادھو کو دیکھتے ہی کہا:

"میرے لڑکے نے بتایا کہ آپ بیمار ہیں۔ میں اس لئے آیا تھا کہ آپ کی کچھ خدمت کر سکوں۔"

"لیکن تم جھانک کیوں رہے تھے؟" سادھو نے غصہ سے پوچھا۔

کانتھا کے ہونٹ کپکپانے لگے اور اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا۔ سادھو غصے سے چلایا:

اس سے پہلے کہ کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آئے تم یہاں سے چلے جاؤ۔"

کانتھا خوف اور دہشت سے الٹے پاؤں بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کے ذہن میں سادھو کی پراسرار حیثیت کے متعلق توہمات اور شکوک کا ہجوم امنڈ آیا۔ تاہم اس کا لڑکا روزانہ علی الصباح کیلے اور مکھن سادھو کی جھونپڑی پر رکھ آتا... اور اس کے واپس چلے آنے کے بعد سادھو ان چیزوں کو اٹھا لیتا۔

ایک ہفتہ یوں ہی گزر گیا' شیر نے کوئی شکار نہیں کیا۔ لوگوں نے سوچا کہ شیر کسی اور جنگل میں چلا گیا ہے' لیکن کانتھا کو یقین تھا کہ چونکہ اس کی بندوق سے سادھو زخمی ہو چکا ہے' اس لئے وہ شیر کا روپ نہیں دھار رہا ؛ تاہم اُس نے اپنے اس خیال کو کسی پر ظاہر نہیں کیا۔

ایک روز گاؤں کا لڑکا گیرو جنگل میں بھینسوں کا ریوڑ چرا رہا تھا۔ ہری ہری گھاس تھی آسمان ابر آلود تھا۔ گیرو بے خود ہو کر گانے لگا۔ اچانک شیر دھاڑا۔ گیرو چونک پڑا۔ شیر نے جست لگائی اور ایک بھینس کی گردن پر سوار ہو گیا۔ بھینسوں کی یہ عادت ہے کہ وہ حملہ آور کا مشترکہ طور پر مقابلہ کرتی ہیں اور ایک کو مصیبت میں دیکھ کر اپنی جان بچانے کے لئے بھاگ نہیں جاتیں۔ بھینسوں نے اپنی سینگوں سے شیر پر حملہ کر دیا۔ گیرو یہ دیکھ کر خود بھی شیر پر حملہ کرنے کے لئے آگے بڑھا۔ اُس وقت اُس کے ہاتھ میں ایک موٹی سی لکڑی تھی اس نے شیر کے منہ پر یہی لکڑی ماری۔ شیر نے بھینسوں کو چھوڑ کر گیرو کو آدبوچا۔ اس سے پہلے کہ وہ اُسے چیرتا پھاڑتا' بھینسوں نے ایک بار پھر اپنے نوکیلے سینگوں سے شیر پر ہلہ بول دیا۔ آخر شیر بوکھلا کر جنگل میں بھاگ گیا۔ گیرو شدید زخمی ہوا' وہ بالکل حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ پورا دن اور ساری رات وہیں پڑا کراہتا رہا۔ بھینسیں اس کے گرد حلقہ بنا کر وہیں کھڑی رہیں۔ شام کے وقت بھینسوں کا ریوڑ اور اُن کا رکھوالا گاؤں نہیں پہنچا' تو گاؤں میں کھلبلی مچ گئی۔ رات بہت تاریک تھی۔ اس لئے کوئی بھی اُن کی تلاش میں باہر نہ نکلا۔ صبح کے وقت گاؤں والے تلاش میں نکلے۔ جب وہ ریوڑ کے قریب پہنچے' تو گیرو دم توڑ چکا تھا۔

یہ پہلا موقع تھا کہ شیر نے دن کے وقت ۔ ۔ ۔ حملہ کیا اور ایک شخص کو ہلاک کر ڈالا۔ ایک بار پھر خوف و ہراس کی لہر دوڑ گئی۔ دوسرے ہی روز ایک اور واقعہ نے لوگوں کو ہراساں کر دیا۔ گاؤں کا ایک نوجوان لکڑی کاٹنے جنگل میں جا رہا تھا۔ اس نے زمین پر سے اڑتی ہوئی ایک مورنی دیکھی جس کے پیچھے میں تازہ تازہ گھاس اُلجھی ہوئی تھی۔ نوجوان کو خیال آیا کہ مورنی نے انڈے دئے ہوں گے۔ اور ممکن ہے وہاں اُس کے بچے بھی موجود ہوں۔ یہ سوچ کر وہ آگے بڑھا ہی تھا کہ اُسی جگہ سے جہاں سے اُس نے مورنی کو اڑتے دیکھا تھا' شیر نے چھلانگ لگائی اور اس دیہاتی نوجوان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے۔ اس نے اُس کا پیٹ اور سینہ ہڑپ کر لیا اور باقی جسم کو وہیں چھوڑ کر چلا گیا۔

اب کانتھا نے سادھو کے متعلق اپنے شبہات کا اظہار شروع کر دیا اور شیر پر بندوق چلانے' سادھو کے زخمی ہونے اور اس کی برہمی کی داستان سنائی۔ ان تمام واقعات کا منظر عام پر آنے سے لوگوں میں بے چینی پیدا ہو گئی۔ گاؤں والوں نے فیصلہ کیا کہ ایک

وفد سادھو سے جا کر ملے اور اس سے استدعا کی جائے کہ وہ اس خونیں ڈرامے کو بند کر دے۔ کانتھا نے اس وفد کی قیادت کی۔

گاؤں کے دس سیانے سادھو کی جھونپڑی میں پہنچے، وہ آنکھیں بند کیے مالا جپ رہا تھا۔ سب مؤدب بیٹھ گئے۔ دس منٹ کے بعد سادھو نے آنکھیں کھولیں، کانتھا نے ہاتھ جوڑتے ہوئے عرض کی

"سوامی جی، آپ جب سے اس گاؤں میں آئے ہیں، باغوں میں بہار آ گئی ہے لیکن مویشی اور انسان اپنے آپ کو غیر محفوظ محسوس کرنے لگے ہیں۔ ہم آپ کے گیان کے معترف ہیں۔ جو شیر ہمارے مویشیوں اور انسانوں کو لقمہ بناتا ہے، وہ آپ کا مطیع ہے، وہ آپ کی جھونپڑی کے پاس سے دھاڑتا ہے لیکن آپ کو کچھ نہیں کہتا۔ آپ اُس سے کہیے کہ وہ یہاں سے چلا جائے اور اگر آپ خود انسان کا جسم چھوڑ کر شیر کا روپ دھار لیتے ہیں، تو ہماری درخواست ہے کہ ہمارے گاؤں پر رحم کیجیے۔ ہمارے مویشیوں اور انسانوں کو شکار نہ کیجیے۔ اگر آپ انسانوں کا شکار کیے بغیر نہیں رہ سکتے، تو میں عرض کروں گا کہ میسور کی سرحد پر باواک اور کرمبا قبائل آباد ہیں، وہاں چلے جائیے۔ وہ وحشی ہیں۔ اور اُن کے نزدیک انسانی جانوں کی کوئی وقعت نہیں۔"

سادھو بالکل خاموش بیٹھا رہا۔ کبھی کبھار وہ آنکھیں اُٹھا کر کانتھا کو دیکھ لیتا اور کبھی وہ وفد کے دوسرے ارکان کو اپنی سرخ سرخ آنکھیں دکھاتا رہا۔

کانتھا اس استدعا کے بعد اپنی جگہ مؤدب بیٹھ گیا۔ سادھو نے آنکھیں اُٹھائیں اور اپنی مالا کو انگلیوں سے گھماتے ہوئے کہا:

"میں ایک شرط پر یہاں شکار کرنا بند کر سکتا ہوں۔"

سب کے دل دھڑکنے لگے، وہ مجسّم سوال بنے ہوئے تھے۔ سادھو نے کہنا شروع کیا "مجھے ہر مہینے سو روپے ادا کیے جائیں، چاول، گھی، سبزیاں، کیلے اور مکھن روزانہ اسی جھونپڑی میں پہنچائے جائیں اور کبھی کبھار مجھے انسانی گوشت کی ضرورت محسوس ہو تو میں میسور کی سرحد پر قبائلیوں کو شکار کرنے چلا جایا کروں گا۔"

اور تمام شرطیں پوری کی جا سکتی تھیں لیکن غریب دیہاتی سو روپے ماہوار کا انتظام نہیں کر سکتے تھے۔ کانتھا نے درخواست کی کہ رقم گھٹا کر پچاس روپے ماہوار کر دی جائے لیکن سادھو نے اُسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ وفد ناکام واپس آ گیا۔

اس واقعہ کے چوتھے روز شیر نے دن دھاڑے ایک اور شخص کو ہلاک کر ڈالا۔ وہ اس وقت اپنی جھونپڑی سے ایک فرلانگ دور اپنے باغ کی رکھوالی کر رہا تھا۔ شیر نے اُسے بھاگنے کا موقع نہیں دیا، اُسے دبوچا اور چیر پھاڑ دیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ شخص اُن دس سیانوں میں سے ایک تھا جو وفد لے کر سادھو کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور اُسی نے سو روپے ماہوار دینے کی سب سے

زیادہ مخالفت کی تھی۔

مجھے یہ سارا واقعہ میرے ذاتی خدمتگار بورا نے سنایا جو اسی گاؤں کے قبیلہ اریلا کا ایک فرد تھا۔ میں اُن دنوں اس جنگل میں شیر کا شکار کرنے آیا تھا۔ بورا اس علاقے کے چپّے چپّے سے واقف تھا، وہ میرے لئے بے حد مفید ثابت ہو سکتا تھا۔

اس وقت میں اور بورا جنگل میں آم کے درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے اور ہم نے اپنے نزدیک آگ کا ایک بڑا الاؤ روشن کر رکھا تھا۔ رات بھیگ رہی تھی، دور سے جنگلی ہاتھی کے بانسوں کو توڑنے کی آواز بلند ہوئی اور تھوڑی ہی دیر بعد جنگل شیر کی آواز سے گونج اُٹھا۔ بورا خوف سے بید کی طرح کانپنے لگا۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا: "سادھو شیر نے میری باتیں سن لی ہیں، اب اب وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ میں تباہ ہو گیا۔"

میں نے اُس کی ہمت بندھانے کے لئے کہا:

"یہ تمہارا وہم ہے، شیر اتنی دور سے تمہاری باتیں نہیں سن سکتا، وہ مافوق الفطرت طاقت نہیں ہے"

اس کے ساتھ ہی میں نے ۴۰۵ بور کی رائفل میں کارتوس ڈالے اور ٹارچ سنبھال لی۔ ہمارے تین طرف آگ کا الاؤ روشن تھا اور خالی سمت کی حفاظت کے لئے ہمارے پاس رائفل موجود تھی۔ شیر ایک بار پھر گرجا۔ وہ ندی کے قریب ہی تھا، بورا مسلسل کہہ رہا تھا کہ اب ہماری خیر نہیں، سادھو شیر نے سب کچھ سن لیا ہے، ہم صبح تک زندہ نہیں رہیں گے۔ میں نے اُس کی طرف غصّے بھری نظروں سے دیکھا اور چپ ہو گیا۔

اتنے میں جنگلی ہاتھی کے چنگھاڑنے کی آواز آئی۔ ہم دونوں سہم گئے۔ الاؤ کی روشنی میں کافی دور تک دیکھا جا سکتا تھا۔ میرے پاس ٹارچ بھی تھی، لیکن میں اُسے مصلحتاً روشن نہیں کرنا چاہتا تھا تھوڑی دیر کے بعد ہاتھی کے چنگھاڑنے اور شیر کے غرانے کی آواز ابھری۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ قریباً چار سو گز کے فاصلے پر دونوں کشتی لڑ رہے ہیں۔ میں نے ٹارچ روشن کی۔ شیر نے ہاتھی کو دبوچ لیا تھا اور اُس کی گردن سے خون پی رہا تھا۔ ٹارچ روشن ہوتے ہی شیر نے چھلانگ لگائی اور اور ندی کی جانب ہو گیا۔

وہ رات ہم نے جاگ کر گزاری۔ بورا کا بُرا حال تھا۔ ہم نے اِرد گرد سے جمع کی ہوئی لکڑیاں الاؤ میں ڈال دیں۔ میں چاہتا تھا کہ بورا باتیں کرتا رہے کہیں ہم نیند سے اونگھنا شروع نہ کر دیں۔ لیکن اُس کے ہوش و حواس گم تھے، وہ اب سادھو شیر کے متعلق ایک لفظ بھی منہ سے نکالنے کے لئے تیار نہیں تھا۔

صبح ہوئی، تو سب سے پہلے ہم نے مرے ہوئے ہاتھی کو دیکھا، وہ ابھی پوری طرح جوان نہیں ہوا تھا۔ معلوم نہیں کیسے اپنی ٹولی سے بچھڑ گیا۔ ہاتھی عموماً گروہ کی صورت میں گشت کرتے ہیں۔

ناشتے کے بعد میری سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ میں اُس سادھو سے ملوں جو عام روایت کے مطابق رات کو اور کبھی کبھی دن کو شیر بن جاتا ہے۔ جب میں نے بورا سے اس کا ذکر کیا، تو اس کا چہرہ فق ہوگیا۔ اس نے ساتھ جانے سے صاف انکار کر دیا، لیکن جب میں نے اُس کی حفاظت کا پورا یقین دلایا اور بہت بڑے انعام کی لالچ دیا، تو وہ بادلِ ناخواستہ تیار ہوگیا۔

اس وقت صبح کے نو بجے تھے۔ میں نے سادھو کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ بورا میرے پیچھے کھڑا ہوا خوف سے کانپ رہا تھا۔ دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ انتہائی بدہیئت، آوارہ بالوں اور بے ترتیب اُلجھی ہوئی داڑھی والا سادھو غلیظ اور بدبودار کپڑوں میں ملبوس ہمارے سامنے آ کھڑا ہوا اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کہنے کے لئے ہونٹ ہلاتا، سادھو کی آنکھیں انگارے برسانے لگیں۔ وہ گرجدار آواز میں بولا۔

"میں جانتا ہوں کہ تم یہاں ضرور آؤ گے اور یہ جو تمہارے پیچھے گیدڑ کی طرح کانپ رہا ہے، یہی تمہیں یہاں لایا ہے۔ میں نے رات تم دونوں کو ندی کے کنارے دیکھا تھا۔ تم نے الاؤ روشن کر رکھا تھا۔ میں تم دونوں میں سے ایک کو ضرور چٹ کر جاتا، لیکن وہ ہاتھی کا بچہ مزاحم ہوگیا۔ اور میں نے تمہارے بجائے اس پر حملہ کر دیا۔"

بورا گڑگڑا کر معافی مانگنے لگا، لیکن میں نے اُسے ڈانٹ دیا۔ میں چاہتا تھا کہ اس مکار سادھو کو گولی کا نشانہ بنا دوں، لیکن اس طرح میں قانون کی زد میں آتا تھا۔ میں غصّے سے کانپنے لگا۔ میں نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے سادھو سے کہا۔

"تم جھوٹ بکتے ہو، تم انسان ہو اور کسی طرح شیر کا قالب اختیار نہیں کر سکتے۔ تم ان اَن پڑھ، معصوم، اور بھولے بھالے اور توہم پرست دیہاتیوں کو بیوقوف بنا کر اپنا الّو سیدھا کر سکتے ہو۔ لیکن مجھے کسی مغالطے میں نہیں ڈال سکتے۔"

سادھو نے دھیمی آواز میں کہنا شروع کیا۔

"سفید بابو، اتنا غصّے نہ ہو۔ تم اپنے کام سے کام رکھو۔ جن باتوں کو تم نہیں جانتے ان میں کیوں دخل دیتے ہو۔ تم یہاں بے سہارا ہو، بہتر ہے کہ تم لوٹ جاؤ ورنہ یاد رکھو تمہیں اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔"

یہ کہہ کر سادھو مڑا اور زور سے جھونپڑی کا دروازہ بند کر دیا۔

بورا نے جھونپڑی کے گرد بعض نشانات کی طرف اشارہ کیا جو شیر کے پنجوں سے ملتے جلتے تھے اور دور تک چلے گئے تھے۔ ہم دوبارہ اُسی آم کے درخت کے نیچے آ گئے جہاں ہم نے الاؤ کے گرد رات گذاری تھی۔ میں نے درخت پر مچان باندھی اور اسی پر بستر لگا کر سو گیا۔ بورا رات بھر جاگتا رہا تھا، وہ بھی مچان پر ایک طرف لیٹ گیا اور خراٹے لینے لگا۔ میں تین گھنٹے

سویا ہوں گا، لیکن یقین کیجئے مجھے نیند میں شیر دکھائی دیتا رہا جس کا سر سادھو سے ملتا جلتا تھا۔ دراصل میرے دل میں بھی ایک عجیب سا خوف پیدا ہو گیا تھا۔ سادھو نے ہمارے متعلق جو کچھ کہا تھا، وہ حرف بحرف ٹھیک تھا۔ اگر خود سادھو رات کی تاریکی میں ہماری نگرانی کر رہا تھا، تو یقیناً وہ ایک بہادر انسان تھا۔ کیونکہ شیر اور ہاتھیوں کی موجودگی میں تن تنہا گھومنا معمولی بات نہیں۔

میں نے محسوس کیا کہ میرا مقابلہ ایک سے نہیں دو سے ہے، آدم خور شیر اور مکار سادھو سے شیر کو تو شکار کیا جا سکتا تھا، لیکن سادھو کے فریب کا پردہ چاک کرنا بڑا دشوار تھا۔ اس نے مجھے مار ڈالنے کی دھمکی بھی دی تھی۔ وہ انسان ہونے کی حیثیت سے سوچ سکتا تھا، منصوبے بنا سکتا تھا اور مجھے دھوکے فریب سے نقصان پہنچا سکتا تھا، اس لئے اُس سے نبٹنا سب سے مشکل تھا۔ سوچ سوچ کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر شیر کا شکار ہو گیا تو سادھو کے فریب کا راز خود بخود کھل جائے گا۔ اس لئے پہلے شیر کا شکار کرنا ضروری ہے۔

میں نے بورا کو ساتھ لیا اور دو جانور خریدنے کے لئے گاؤں میں آ گیا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب گاؤں کے ہر شخص نے کسی بھی قیمت پر جانور فروخت کرنے سے انکار کر دیا۔ ہر شخص یہی کہتا تھا کہ شیر کے روپ میں تم سادھو کو قتل کر دو گے اور اگر سادھو اس روپ میں نشانہ بن گیا تو پورے گاؤں پر کوئی آسمانی آفت ٹوٹ پڑے گی۔ میں نے لاکھ سمجھایا کہ میں یہ سب کچھ تمہاری جانوں کی حفاظت کے لئے کر رہا ہوں اور انسان کبھی شیر کا قالب اختیار نہیں کر سکتا۔ لیکن کسی نے بھی میری بات پر کان نہیں دھرا اور بچھڑے فروخت کرنے سے سختی کے ساتھ انکار کرتے رہے۔ اب ایک ہی صورت تھی کہ میں اور بورا دس میل چل کر دو رمنگوڈی گاؤں جائیں اور وہاں سے جانور خرید کر لائیں، لیکن ہم اُسی روز غروب آفتاب سے پہلے کسی طرح بھی نہیں لوٹ سکتے تھے، اس لئے ہم نے اپنا پروگرام اگلے روز پر ملتوی کر دیا اور پھر اُسی آم کے درخت کے نیچے رات گذارنے کے لئے پہنچ گئے۔ یہ بھی ایک عجیب بات تھی کہ ہمیں گاؤں میں کوئی شخص اپنی جھونپڑی میں پناہ دینے کے لئے تیار نہیں تھا۔

ہم نے ایک بار پھر الاؤ روشن کیا اور اپنے قریب اتنی لکڑیاں اور خشک پتے جمع کر لئے کہ ساری رات آگ جلتی رہے۔ بورا کی خواہش تھی کہ ہم رات جاگ کر کاٹنے کے بجائے مچان پر سو کر گذاریں، لیکن مجھے شیر کی نسبت مکار سادھو سے زیادہ خطرہ تھا کہ اگر ہم سو گئے، تو ممکن ہے وہ ہماری جان لے بیٹھے۔ اس رات بورا نے سادھو، شیر کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں کہا اور وہ چپ چاپ بیٹھا رہا۔ جنگل میں ہر طرف سکوت طاری تھا، کبھی کبھار کوئی مینڈک ٹراتا یا درختوں پر بیٹھے ہوئے پرندوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دے جاتی۔

میں نے گھڑی پر نظر ڈالی، بارہ بج رہے تھے اور نیند کی وجہ سے ہماری آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں کہ اچانک ندی کے قریب سے ایک عجیب و غریب آواز سنائی دی۔ کوئی آہاہا، آہاہا کہتا جاتا تھا اور پھر اچانک یہی آواز شیر کی گرج بن گئی۔ بورا تو سہم کر سکڑ گیا، لیکن میں اپنی رائفل اور ٹارچ سنبھال کر بیٹھ گیا۔ میں سمجھ گیا کہ سادھو ہمیں ڈرانا چاہتا ہے۔ پہلی آواز سے اُس نے اپنے انسانی وجود کا احساس دلانے کی کوشش کی ہے اور دوسری آواز سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اب وہ شیر کے قالب میں آگیا ہے۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ اُس کو ابھی پکڑ لیا جائے۔ ہم دونوں ٹارچ کی روشنی میں اُسی آواز کی طرف دوڑتے گئے، لیکن وہاں دور دور تک سادھو تھا نہ شیر۔ ہم سیدھے اُس کی جھونپڑی پر پہنچے، اندر دیا روشن تھا، ہماری آہٹ پا کر سادھو نے از خود دروازہ کھول دیا اور غضبناک ہو کر بولا۔

"زندگی عزیز ہے، تو بھاگ جاؤ، تم شیر کی روح کو ہرگز شکار نہیں کر سکتے۔"

میں حیران تھا کہ سادھو ہم سے پہلے یہاں کیسے پہنچ گیا۔ میں شکاری ہونے کی حیثیت سے بہت تیز دوڑتا تھا اور جھونپڑی تک پہنچنے کے لئے جو راستہ میں نے اختیار کیا تھا، وہ مختصر تھا۔ سادھو نے ایک بار پھر مجھے اُلجھن میں ڈال دیا۔ گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے ہم پھر درخت کے نیچے پہنچ گئے اور رات کا باقی حصہ الاؤ کے نزدیک جاگ کر گزار دیا۔

صبح ہوئی ہم مینگوڈی گئے، وہاں سے دو بچھڑے خریدے اور اُلٹے پاؤں واپس آئے۔ اُس وقت شام کے چار بج رہے تھے اور سورج غروب ہونے میں صرف دو گھنٹے باقی تھے۔ دوسری طرف ہمیں نیند نے ستایا ہوا تھا۔ دو راتوں سے آنکھ نہیں جھپکی تھی۔ دن میں دو تین گھنٹے سونے سے کہاں سکون مل سکتا تھا۔ اور اب تیسری رات جاگ کر گزارنا تھی۔ بورا کا تو بُرا حال تھا۔ ہم نے جلدی سے چائے تیار کی، کچھ سینڈوچ کھائے اور کچھ کیلے۔ باقی چائے تھرماس میں بھر کر مچان پر رکھ لی۔ ایک بچھڑے کو مچان سے پچاس گز کے فاصلے پر باندھ دیا گیا اور دوسرے کو بورا اپنی جھونپڑی میں چھوڑ آیا۔ بدقسمتی سے اُس رات شیر بالکل نہیں دھاڑا اور ہماری تمام محنت اکارت گئی۔ رات ہم صبح تک جاگتے رہے تھے اور سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ایسے سوئے کہ دوپہر کے بارہ بجے آنکھ کھلی۔

بورا نے یہ تجویز رکھی کہ ہمیں یہاں سے ہٹ کر ندی کے اور قریب برگد کے درخت پر مچان باندھنا چاہیئے۔ اس کا خیال تھا کہ شیر ندی پر پانی پینے ضرور آتا ہے۔ برگد کے درخت پر بھی مچان اور محفوظ بندھتی ہے۔ اس درخت کے پتے چوڑے اور ایک دوسرے سے بہت زیادہ قریب ہوتے ہیں۔ مجھے یہ تجویز پسند آئی اور ہم فوراً اس طرف چل دیئے۔ بورا نے گھنٹہ بھر کی جدوجہد

کے بعد برگد کے سہ شاخے پر مچان تیار کی اور بچھڑے کو پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر باندھ دیا۔

شام ڈوبنے لگی، پرندے غول کی صورت میں اپنے گھونسلوں کی طرف جا رہے تھے۔ ندی کے صاف پانی میں چاند کی کرنیں حسن کو تخلیق کر رہی تھیں اور ہم بیارے سمے میں شیر کا انتظار کر رہے تھے۔ ابھی ہمیں اڑھائی تین گھنٹے ہی ہوئے تھے کہ میرے کندھے پر کسی نے ہاتھ رکھا، میں سخت گھبرایا کہ مچان پر یہ تیسرا کون آگیا۔ تصور میں سادھو کا چہرہ گھوم گیا۔ یہ ہاتھ سیاہ لمبے لمبے بالوں اور پتلی پتلی انگلیوں والا تھا۔ میرے جسم میں خوف کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ میں نے سر گھما کر دیکھا، دو سرخ چھوٹی چھوٹی آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔ میری ہنسی چھوٹ گئی اور وہ سیاہ ہیولی چیختا ہوا برگد کی ٹہنیوں سے لٹکتا، پھلانگتا دور بھاگ گیا۔ یہ لنگور تھا۔ یہ انسان سے بہت مانوس ہے۔

جب رات خوب بھیگ گئی اور جنگل میں ہر طرف سناٹا چھا گیا، تو اچانک شیر کے دھاڑنے کی آواز آئی۔ شیر ایک بار اور گرجا۔ یہ آواز سادھو کی جھونپڑی سے آ رہی تھی، میں نے رائفل سنبھالی اور ٹارچ درست کر کے بیٹھ گیا۔ ایک پراسرار سکوت طاری تھا۔ جنگل میں رات کو شیر عموماً تین چار بار دھاڑتا ہے۔ میں اس کی ایک اور آواز سننے کے لئے بے چین تھا۔ آدھ گھنٹہ اسی طرح گذر گیا۔ معاً مجھے خیال آیا کہ جھونپڑی کے پاس چل کر دیکھنا چاہیئے کہ سادھو موجود ہے یا نہیں۔

میں نے بورا کو ہدایت کی کہ وہ مچان پر بیٹھا رہے اور اُسے یہ بتائے بغیر کہ میں کہاں جا رہا ہوں درخت سے نیچے اُتر آیا۔ میں ٹارچ کی روشنی میں آگے بڑھتا رہا۔ کارتوسوں سے بھری ہوئی رائفل میرے ہاتھ میں تھی۔ میں انتہائی محتاط قدم اُٹھا رہا تھا، مبادا شیر بے خبری میں مجھ پر حملہ کر دے۔ جب میں جھونپڑی کے قریب پہنچا، بانسوں کے سوراخوں سے اندر دیئے کی لو صاف نظر آ رہی تھی۔ پہلے تو میں نے چپکے سے ان ہی سوراخوں کے اندر جھانکنے کی کوشش کی، لیکن جب سادھو کے متعلق واضح طور پر کچھ معلوم نہ ہو سکا، تو میں دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ جھونپڑی خالی تھی، سادھو باہر گیا ہوا تھا۔ میرے دل میں ہلکا سا خوف اُبھرا۔ بورا کی سنائی ہوئی داستان خیالات میں حقیقت بن کر گھومنے لگی۔ میں جھونپڑی سے باہر نکل آیا اور سادھو کا انتظار کرنے لگا۔

آدھ گھنٹہ گذر گیا، نہ سادھو آیا نہ شیر تیسری بار گرجا۔ معاً میرے ذہن میں ایک خیال اُبھرا۔ شیر اپنے ہم جنس کی آواز پر لپکتا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ شیر اپنے کہیں نزدیک ہی موجود ہے۔ اس لئے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے منہ کے قریب ایک مخصوص زاویے سے حلقہ بنایا اور شیر کی سی آواز نکالی۔ یہ طریقہ میں نے افریقہ کے جنگلوں میں جنگلی قبائل سے سیکھا تھا۔ وہ شیر کا شکار اسی طرح کیا کرتے تھے۔ آواز سن کر جونہی شیر اُن کی جانب بڑھتا، وہ اپنے زہر میں بجھے ہوئے نیزوں سے اُس

پر حملہ کرتے اور آن واحد میں شکار کر لیتے تھے۔

میری یہ تدبیر کارگر ثابت ہوئی۔ میری آواز کے جواب میں شیر پھر دھاڑا۔ میں خشک پتوں پر کسی کے چلنے اور اپنی جانب بڑھتے ہوئے قدموں کی چاپ سننے لگا۔ میں جھونپڑی کے قریب ہی زمین پر لیٹ گیا قدموں کی چاپ کی طرف میری رائفل کا رخ ہو گیا اور میں آنے والے لمحوں کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ اچانک میں نے ایک ہیولا کو اپنی جانب بڑھتے ہوئے محسوس کیا۔ وہ انسان کی طرح سیدھا دو پاؤں پر چل رہا تھا لیکن اُس کے جسم پر شیر کی کھال لپٹی ہوئی تھی۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ یہ سادھو ہے جو شیر کی کھال اُوڑھ کر جنگل میں گھوم رہا ہے اور اب اپنی جھونپڑی میں واپس آ رہا ہے۔ سادھو ابھی مجھ سے پچاس گز دور تھا کہ شیر ایک بار پھر گرجا۔ پھر میں نے المناک منظر دیکھا کہ شیر اور سادھو گتھم گتھا ہو گئے، وہاں اُونچی اونچی گھاس تھی۔ شیر نے بھپڑ مار کر سادھو کو نیچے گرا لیا تھا۔ اب وقت ضائع کرنا حماقت تھی۔ سادھو کی جان خطرے میں تھی۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا، ٹارچ کی روشنی میں میں نے رائفل چلا دی۔ گولی شیر کی داہنی آنکھ میں لگی۔ میں نے لبلبی پر دوبارہ انگلی رکھی۔ رائفل سے شعلہ سا لپکا اور گولی شیر کے دماغ کو چیرتی ہوئی پار ہو گئی۔ شیر ایک بار اُچھلا اور پھر زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ میری تیسری گولی اُس کے جبڑے میں پیوست ہو گئی اور وہ ہمیشہ کے لئے ٹھنڈا ہو گیا۔

سادھو شدید زخمی ہو گیا تھا۔ شیر نے بھپڑ مار کر اُس کی گردن کا منکا توڑ دیا تھا، مجھے دیکھتے ہی کہنے لگا۔

سفید بابو تم جیت گئے۔ قسمت کے ستارے میرے خلاف تھے۔ شیر نے میری جان لے لی لیکن تم بھی نہ بچ سکو گے۔ میں اس دنیا میں اُس وقت کا انتظار کروں گا۔ جب کسی اور شیر کا بھپڑ تمہاری گردن کا منکا ڈھلکا دے گا۔

یہ کہتے ہی سادھو کراہا اور پھر اُس کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں۔

میں فوراً ہی برگد کے درخت کے نیچے پہنچا اور چلا چلا کر بورا کو پکارنے لگا۔ وہ اُونچی مچان پر اونگھ رہا تھا۔ میری آواز سنتے ہی وہ نیچے اُتر آیا۔ جب میں نے اُسے بتایا کہ میں نے شیر کو گولی کا نشانہ بنا دیا ہے، اور سادھو بھی مر گیا ہے، تو حیرانی سے اُس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ گاؤں کی طرف دوڑتا ہوا گیا اور آدھی رات کے وقت چلا چلا کر لوگوں کو بتانے لگا:

"سفید بابو نے آدم خور شیر اور مکار سادھو دونوں کو ہلاک کر دیا ہے"۔ (اردو کے ایک ڈائجسٹ سے ماخوذ)

چارلس کورنٹے
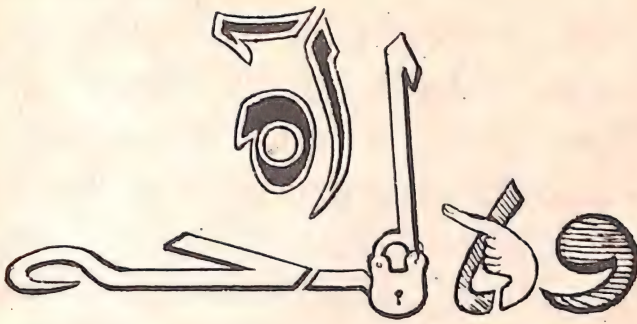
میں غالباً دنیا کا واحد لوہار ہوں جسے سرکاری طور پر اپنے کام کا سب سے زیادہ معاوضہ ملتا ہے۔ میرے ہاتھ کی انگلیوں نے محیرالعقول کارنامے انجام دیے ہیں۔ ان انگلیوں سے اگر میں نے ان الماریوں کی خفیہ کنڈیاں کھولی ہیں جن میں ملکہ آزابیلا اپنے قیمتی جواہرات اور زیورات رکھتی تھیں، تو جرائم پیشہ افراد کو گرفتار کرانے کے لئے بند دروازے بھی کھولے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک انشورنس کمپنی نے میرے ہاتھوں کی صرف ان دس انگلیوں کا بیمہ ایک لاکھ ڈالر کیا ہے اور وہ میری انگلیوں کی حفاظت کے لئے خاص اہتمام کرتی ہے۔

بچپن ہی سے میری انگلیاں ہر قسم کے تالے، گھڑیاں اور کاروں کے قفل بآسانی کھول لیتی تھیں۔ میں سات سال کی عمر ہی میں مقفل الماریوں میں سے جیلی کے ڈبے، لکڑی کی چھوٹی چھوٹی چھڑیوں اور چاقو کی مدد سے نکال لیا کرتا تھا اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی تھی۔ میرا فرانسیسی باپ بڑا سخت گیر تھا، اگر وہ کسی وقت اپنے اچھے موڈ میں ہوتا، تو مجھے اپنی میز کی دراز میں رکھی ہوئی دو بڑی بڑی چابیاں کھیلنے کے لئے دیا کرتا تھا۔ یہ چابیاں پشتہا پشت سے ہمارے خاندان میں چلی آتی تھیں۔ دراصل یہ چابیاں شہرۂ آفاق ناول نگار جیولیس ورن کی ملکیت تھیں اور اب یادگار کے طور پر ہم ان کی حفاظت کر رہے تھے۔

مجھے ورن کی کہانیاں پڑھنے میں بڑا لطف آتا تھا۔ خصوصاً وہ کہانی تو مجھے بے حد پسند تھی جس میں سمندر کے متعلق بڑی و پُراسرار باتیں بتائی گئی تھیں۔ دراصل ان کہانیوں کو پڑھنے ہی سے میرے دل میں تجسس اور محیرالعقول کارنامے انجام دینے کا خیال پیدا ہوا۔ میری عمر نو برس تھی کہ باپ کی

طبیعت سے گھبرا کر میں گھر سے بھاگ نکلا۔ اور میر بون میں ایک لوہار کے ہاں ملازم ہو گیا۔ کام تو میں ہر ایک کر لیتا تھا، لیکن دل میرا چابیاں بنانے ہی میں لگتا تھا۔ معاً ایک خوبصورت لڑکی نے میرے دل کی دنیا بدل دی۔ اس کی نیلگوں آنکھوں میں جھانکنے کے لئے میرے پاس صرف ایک ہی چیز کی کمی تھی اور وہ تھی — تعلیم —— میں لوہار کی دکان سے اُٹھا اور ریپورٹس ماؤتھ چلا گیا اور حصولِ علم کے لیے جدو جہد کرنے لگا۔ میرا باپ میری ٹوہ میں تھا، یہاں آ پہنچا اور مجھے جرمنی لے گیا۔ اس وقت جرمنی کو آج کی طرح دیوارِ برلن نے دو حصّوں میں تقسیم نہیں کیا تھا۔ میں بون میں ایک لوہار کی دُکان پر ملازم ہو گیا۔ رفتہ رفتہ خوبصورت لڑکی کی نیلگوں آنکھیں دور ہوتی چلی گئیں اور میرا تعلیم حاصل کرنے کا جذبہ بھی ماند پڑ گیا۔

آپ پوچھیں گے، میں اپنی ابتدائی زندگی کو اتنی اہمیت کیوں دے رہا ہوں اور یہ ساری داستان کیوں سُنانے لگا ہوں۔ حقیقت یہ ہے، بچپنے کی یہ ساری روئداد ہی تو مجھے اس منزل پر لے آئی ہے جہاں میں نے عجیب و غریب کارنامے انجام دیئے ہیں۔ پانچ سال کے بعد میں امریکہ چلا آیا اور فوج میں بھرتی ہو گیا لیکن ۱۹۳۱ء میں جب میری عمر ۲۲ سال تھی، مجھے فوج سے فارغ کر دیا گیا۔ میں ایک بار پھر پورٹس ماؤتھ چلا گیا اور یہاں تالے، چابیاں بنانے کی اپنی دکان کھول لی۔ اگرچہ یہ دکان زیادہ دیر نہیں چلی، لیکن اس سے مجھے ایک فائدہ ضرور حاصل ہوا کہ میں اپنے فن میں ماہر ہو گیا۔

انہی دنوں ایک فرم دی میرٹ اینڈ چیمپین ڈیرک کی طرف سے غوطہ خوروں اور بحری کل پُرزوں کے ماہروں کی ضرورت کا اشتہار شائع ہوا۔ چونکہ معاوضہ معقول تھا اور دکان سے آمدنی بھی زیادہ نہیں تھی، اس لیے میں نے دُکان بڑھا دی اور اس فرم میں بھرتی ہو گیا۔ یہ فرم بڑی بڑی انشورنس کمپنیوں اور سرکاری جہاز راں کمپنیوں کے لیے کام کرتی تھی۔ جو جہاز ٹوٹ پھوٹ کر یا آگ لگنے کے باعث سمندر کی تہہ میں بیٹھ جاتے، فرم اُن کا قیمتی سامان نکالنے کا بھاری معاوضہ لیتی تھی۔ مجھے دوسرے ہی روز ساحل سے تین میل دور ایک کشتی میں بھیج دیا گیا۔ وہاں ایک تجارتی جہاز کو غرق ہوئے ایک ہفتہ گزرا تھا۔ اس جہاز میں جہاں لاکھوں کا دوسرا سامان تھا وہاں جواہرات کا ایک قیمتی بکس بھی تھا۔ ان کی مالیت کروڑوں ڈالر تھی اور اس بکس کا ایک انشورنس کمپنی نے چار کروڑ ڈالر میں بیمہ کیا تھا۔ میں فرم میں غوطہ خور کی حیثیت سے ملازم ہوا تھا، حالانکہ اس فن سے مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میں نے اس وقت صرف اتنا سوچا تھا کہ ڈوبے ہوئے جہاز کے بند کیبن کھولنے اور قیمتی چیزیں نکالنے کے لئے ایک ماہر لوہار کی ضرورت یقیناً پیش آتی ہوگی اور ممکن ہے میں وہاں اپنی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کر سکوں۔

غوطہ خوری کا لباس پہن کر اور آکسیجن بکس کمر پر باندھ کر جب مجھے گہرے پانی میں اُترنے کا حکم

دبا گیا، تو ایک بار تو میرے ہوش گم ہو گئے۔ میں ایک اچھا تیراک ضرور تھا، لیکن غوطہ خور کبھی نہیں تھا۔ ۱۹ سالہ بوب بالکل میرے ساتھ ہی کھڑا تھا اور معاون کے طور پر اس نے میرے ساتھ ہی پانی کی سطح کے نیچے اُترنا تھا۔ ہم بارہ غوطہ خور اور اتنے ہی معاون تھے۔ ہمیں صرف اتنا بتایا گیا تھا کہ جواہرات کا بکس کپتان کے کیبن سے ملحق ایک چھوٹے سے محفوظ کمرے میں موجود ہے۔ یہ کمرہ لوہے کی مضبوط چادر کا بنا ہوا ہے اور جس چابی سے اسے مقفل کیا گیا ہے وہ کپتان کے کیبن میں مشرقی دیوار کے اندر ایک بند طاقچے میں آویزاں ہے۔ یہ طاقچہ بھی مقفل ہے اور اس کی چابی اسی کیبن کی میز کی دراز میں ہو گی۔

ابھی تک یہ اندازہ نہیں کیا جا سکا تھا کہ جہاز جب ایک اور امریکی جہاز سے دھند کے باعث ٹکرایا تھا اور اس کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے، تو کون سا حصہ کس سمت گرا تھا۔ جہاز کا عملہ بچا لیا گیا تھا، لیکن جہاز بڑی تیزی سے سمندر کی تہہ میں بیٹھ گیا۔ ہم دو درجن غوطہ خوروں اور معاونوں کو مختلف سمتوں میں پھیل کر جواہرات کا بکس تلاش کرنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ ہمیں جو آکسیجن دی گئی تھی وہ ایک گھنٹے کے لئے کافی تھی۔ اس لئے ہمیں ساٹھ منٹ میں اپنا کام ختم کرنا تھا یا پھر دوبارہ سطح آب پر آکر از سرِ نو آکسیجن لینے کی ضرورت تھی۔ ہمیں یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ اگر چابیاں نہ ملیں، تو آری کے ذریعے آہنی کمرے کو کاٹنے کی کوشش کی جائے۔ سمندر کی تہہ میں تاریکی دور کرنے کے لئے ہمیں خاص قسم کی ٹارچیں مہیا کی گئی تھیں۔

یہ پہلا موقع تھا کہ میں سمندر میں اُتر رہا تھا۔ گو حفاظتی انتظامات کافی تھے؛ تاہم میرے دل میں خوف موجود تھا۔ کپتان نے اشارہ کیا اور ہم کشتی میں بندھی ہوئی زنجیروں کے ساتھ آہستہ آہستہ پانی میں اُترنے لگے۔ بوب اور میرا رُخ شمال مغرب کی طرف تھا۔ میں سمندر کے اندر کی دنیا کا نقشہ نہیں کھینچوں گا۔ اس لیے کہ یہ میرے موضوع سے خارج ہے، لیکن یہ کہے بغیر بھی نہیں رہ سکوں گا کہ خوفناک ہونے کے باوجود یہ دنیا بڑی حسین اور پیاری ہے اور قدرت یہاں اک نت نئے روپ میں جلوہ گر نظر آتی ہے۔

تقریباً دس منٹ کے بعد ہمارے پاؤں جہاز کے کناروں سے ٹکرانے لگے۔ یہاں پانی اتنا گہرا نیلا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سُجھائی نہیں دیتا تھا۔ میں نے ٹارچ روشن کی، جہاز دائیں پہلو پر گرا ہوا تھا۔ میں نے بوب کو اشارہ کیا اور ہم دونوں جہاز میں داخل ہونے کے لیے راستہ ڈھونڈنے لگے۔ پانچ منٹ کی جدوجہد کے بعد ہم ایک راستے سے کپتان کے کیبن کے قریب پہنچ گئے۔ بوب نے دروازہ باہر کی جانب کھینچ کر کھولنا چاہا، لیکن اس نے کھلنے سے انکار کر دیا۔ میں نے بھی بڑا زور لگایا، لیکن ناکام رہا۔ دراصل جہاز جب ڈوبا تھا، تو دھکے سے دروازہ اندر سے بند ہو گیا۔ مجھے فوراً ایک ترکیب سوجھی۔ میں نے

اپنے غوطہ خوری کے لباس کے چمڑے کا کمر خستہ سرا دروازے اور چوکھٹ کے درمیان باریک سی درز میں پھنسا دیا اور پھر ایک ہاتھ سے زوردار جھٹکا دیا اور ساتھ ہی دوسرے ہاتھ میں دروازے کا ہینڈل پکڑ کر اپنی جانب کھینچا۔ دروازہ ایک جھٹکے کے ساتھ کھل گیا۔ اب تک پانی کا دباؤ ہمیں اوپر اٹھا رہا تھا، لیکن کپتان کے کیبن میں داخل ہو کر یہ دباؤ کم ہو گیا اور ہم ایک رُخ لیٹے کمرے میں چلنے لگے۔ میں نے میز کی دراز دیکھی وہ پہلے ہی کھلی ہوئی تھی اور چابی غالباً کہیں پانی میں گر گئی تھی۔ ادھر اسی تگ و دو میں بیس منٹ گزر چکے تھے اور ہمارے پاس آکسیجن صرف چالیس منٹ کے لیے باقی رہ گئی تھی۔

میں نے ہاتھ پھیلا کر طاقچے کا جائزہ لیا۔ وہ بند تھا اور تالا بھی اس کی اندرونی سمت میں لگا ہوا تھا۔ باہر تو صرف چابی کے لیے سوراخ تھا۔ میں نے ادھر ادھر ہاتھ مار کر کوئی باریک سی نکیلی چیز تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن کچھ بھی ہاتھ نہ لگا۔ بوب کے ہاتھ میں آری تھی اور اس کے دندانے کافی نوکیلے اور لمبے تھے۔ میں نے آری کے ایک دندانے کو دانتوں میں دبایا اور دبا کر توڑ لیا۔ اگرچہ ایسا کرتے وقت پانی کی کافی مقدار میرے محفوظ لباس میں داخل ہو گئی لیکن میں نے اس کی پروا نہ کی۔ میں نے ٹوٹے ہوئے دندانے کو لوہے کی میز پر رگڑ کر کچھ اور باریک کیا اور طاقچے کے سوراخ میں ڈال کر گھمانا شروع کر دیا۔ دو تین منٹ کی جدوجہد کے بعد تالا کھل گیا۔ میں نے چابی نکالی اور کیبن سے نکل کر جواہرات والے کمرے کی جانب بڑھا۔ اسی دوران میں غوطہ خور بھی کمرے کی تلاش میں آن پہنچے۔ ہر ایک کے ہاتھ میں ٹارچ تھی، لیکن پھر بھی ایک دوسرے کو زیادہ دور سے نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ ایک غوطہ خور مجھ سے ٹکرایا اور میرے ہاتھ سے چابی چھوٹ کر پانی میں گر گئی۔

یہ نہ پوچھیے اس وقت مجھ پر کیا بیتی۔ ایک ایک منٹ قیمتی تھا۔ صرف بیس منٹ کے لیے آکسیجن باقی رہ گئی تھی اور بنا بنایا کھیل بگڑ چکا تھا۔ سب غوطہ خوروں کا خیال تھا کہ واپس پانی کی سطح پر چلیں اور آکسیجن لے کر کمرے کی دیواروں کو آری کے ذریعے کاٹنے کے لیے دوبارہ لوٹ آئیں لیکن میرے اندر ایک ماہر لوہار جاگ اٹھا اور میں نے ایک بار پھر چابی کے بغیر تالا کھولنے کا عزم کر لیا۔ یہ تالا باہر کی طرف آویزاں تھا، لیکن تھا بڑا ہی پیچیدہ اور جس کنڈی میں پھنسا ہوا تھا وہ دیوار کے اندر جذب تھی، تالا بھی دیوار کے اندر ہی اپنے حجم کے مطابق ایک محراب میں لگا ہوا تھا۔ گویا آری سے کنڈی یا تالے کو کاٹنا ناممکن تھا۔

میں نے اپنی چھنگلی انگلی کے معمولی سے بڑھے ہوئے ناخن کو تالے کے سوراخ پر رکھا اور آہستہ آہستہ اسے گھمانے لگا۔ جس تالے کو میں اس طرح کھولنے کی کوشش کر رہا تھا، وہ بڑا ہی پُرپیچ تھا اور چابی

اس میں تین بار گھومتی تھی۔ ایک بار سیدھی سمت دوسری بار عقبی سمت اور تیسری دفعہ پھر سامنے کے رُخ پر۔ مجھے اس سے پہلے کبھی اس قسم کے تالے سے سابقہ نہیں پڑا تھا، لیکن میری ذہانت کام آئی اور میں نے تالے پر خفیہ نشانات سے معلوم کر لیا کہ تالے کو اس کی چابی سے کھولنے کا طریقہ کیا ہے۔ ہاں ایک بات تو میں بتانا بھول ہی گیا۔ پہلی بار چابی کو گھمانے سے پیشتر نیچے کی طرف دبانا پڑتا تھا اور دوسری بار گھمانے سے پیشتر اُسے اوپر کی جانب اُٹھانا لازمی تھا۔ میرا ناخن تیزی اور ہنرمندی سے یہ سب عمل کر رہا تھا۔ بمشکل چند سکنڈ گزرے ہوں گے کہ تالا کھل گیا۔ میرے مُنہ سے مسرت کی ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

ہم نے جواہرات کا بکس اُٹھایا اور بے پایاں مسرت کے ساتھ پانی کی سطح پر لوٹ آئے۔ کھوئے ہوئے جواہرات پاکر ہم اتنے مسرور تھے کہ مجھے یہ بھی احساس نہ رہا کہ میری چھنگلی کا ناخن اُکھڑ گیا ہے۔ اور انگلی سے خون بہہ رہا ہے۔ مجھے معقول معاوضہ ملا۔ چابی کے بغیر تالے کھولنے کی مہارت حاصل ہوئی اور خود اعتمادی کے نئے جذبے نے شہرتِ دوام بخشی۔

پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تو میری خدمات نیویارک شپ یارڈ نے حاصل کر لیں۔ امریکہ ابھی ابھی جنگ میں شریک ہوا تھا۔ بندرگاہ پر خوب گہما گہمی رہتی تھی۔ امریکیوں نے جرمنوں کے جہاز پر قیصر ولیم کو گرفتار کیا تھا اور وہ اسے گھیر کر بندرگاہ تک لے آئے تھے۔ جرمن کپتان نے گرفتار ہونے سے پہلے جہاز کے ہر اہم کمرے کو مقفل کر دیا اور چابیوں کو پانی میں گرا دیا تھا۔ شپ یارڈ کے انچارج کپتان مورس نے مجھے بُلایا اور ہدایت کی کہ جلد سے جلد جہاز کے تمام مقفل دروازوں کو کھول دوں۔ وہ اہم جنگی رازوں کو ڈھونڈنے کے لیے بے چین تھا۔

میں قیصر ولیم کا کیبنٹ روم کھولنے میں مصروف تھا کہ مجھے اپنے سر پر حدت سی محسوس ہوئی۔ میں نے ابھی اوپر آنکھ بھی نہیں اُٹھائی تھی کہ آگ کے خطرے سے آگاہ کرنے کے لئے سائرن بجنے لگے۔ قیصر ولیم میں آگ لگ گئی تھی۔ مورس نے مجھے آواز دی۔

"جلدی کرو، اس کمرے کو چھوڑ دو، ایک اور تالا کھولنا نہایت ضروری ہے"۔

میں نے بجلی کی ایک تار، ایک رینچ اور ایک چھوٹی سی ہتھوڑی اُٹھائی اور مورس کی طرف بھاگا۔ جہاز کا دایاں حصّہ جل رہا تھا اور اس کے مقابل سمت میں ایک کمرہ ڈائنامیٹ سے بھرا ہوا تھا۔ مورس چاہتا تھا کہ آگ پوری طرح پھیلنے سے پہلے ڈائنامیٹ کو یہاں سے ہٹا دیا جائے، ورنہ خطرہ تھا کہ قیصر ولیم تو ڈوبے گا ہی، پوری بندرگاہ تباہی کا شکار نہ ہو جائے۔ پہلے میں نے رینچ اور ہتھوڑی سے کام لینا چاہا لیکن تالا بڑا ہی مضبوط تھا اور اسے طاقت کے بل پر توڑنے کی سعی لاحاصل تھی

ادھر آگ پھیلتی جا رہی تھی۔ فائر بریگیڈ کی تمام جدوجہد ناکام ہوتی نظر آ رہی تھی۔ مورس بیج رہا تھا۔ ہم سب خطرے میں تھے۔ ہر شخص کو جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ خود کو ناکام ہوتا دیکھ کر میں جھنجھلا اٹھا۔ مگر میرے زرخیز دماغ نے مجھے ایک بات سجھائی۔ میں نے بجلی کے تار کے ٹکڑے کو کنڈی نما سخت گرہ دی اور اسے تالے کے سوراخ میں کھڑی ہوئی کیل میں پھنسا دیا۔ میں تالے کو دیکھ کر ایک نظر میں اس کی ساخت کا اندازہ کر لیا کرتا ہوں۔ یہ جرمنی کا بنا ہوا تالا پُر پیچ ہونے کے باوجود میرے لیے معمّا نہیں تھا۔ مجھے خوب معلوم تھا کہ یہ تالا جب ہتھوڑی کی پیہم ضربوں سے ٹس سے مس نہیں ہوا، تو اسے ذہانت اور ترکیب ہی کھول سکتی ہے۔ میں نے کنڈلی بنی ہوئی تار کو جھٹکا دیا، کیل باہر نکل آئی اس طرح سوراخ کا دائرہ وسیع ہو گیا۔ اب اسی کیل کو میں نے سوراخ میں ڈال کر حرکت دینی شروع کی، لیکن وہاں تو اتنا زنگ لگا تھا کہ کھلنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ مورس اور بہت سے ملاح میرے سر پر کھڑے حیرانی سے دیکھ رہے تھے۔ ان سب کے چہروں پر خوف کی لہریں اُبھرتی اور ڈوبتی تھیں۔ آگ اب اور قریب ہو گئی تھی۔ ہاتھ پاؤں تو میرے بھی پھول گئے، لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری۔

مورس نے سب کو جہاز چھوڑنے کا حکم دے دیا۔ اسے یقین ہو گیا کہ تالا نہیں کھلے گا اور آن واحد میں آگ ڈائنامیٹ تک پہنچ جائے گی، لیکن میں نے آخری کوشش کے طور پر ایک عجیب حرکت کی۔ اپنی قمیص کا دامن پھاڑا۔ اسے تالے کے نشیبی سوراخ اور کنڈے کے پیوست حصے کے گرد سوراخوں میں ٹھونس دیا۔ اب یا تو وہ جگہ باقی رہ گئی تھی۔ جہاں کنڈا تالے کے اندر داخل ہو کر اپنے نصف کٹے ہوئے حصے میں چرخی کی گرفت مضبوط بناتا ہے یا چابی گھمانے کی جگہ خالی تھی۔ اس کے بعد میں نے دونوں ہونٹوں کو موخرالذکر سوراخ پر پیوست کر دیا اور پھیپھڑوں کو پھلا کر پوری قوت سے ہوا داخل کرنی شروع کی۔ ہوا کے دباؤ سے اندر کی کمانی گھومی اور کنڈی میں پھنسی ہوئی آہنی رکاوٹ پھسل گئی۔ تالا کھل گیا ——— مزدوروں اور ملاحوں نے پھرتی کے ساتھ ڈائنامیٹ جہاز سے اتار کر محفوظ جگہ پہنچا دیا۔ تالا کھولنے کی اس ترکیب اور میری جدوجہد پر مجھے خوب داد ملی اور مجھے جلد ہی فورمین بنا دیا گیا۔

ایک روز میں انفنسٹن سٹریٹ میں سے گزر رہا تھا۔ میں نے چیخوں کی آواز سنی۔ ایک چار منزلہ عمارت آگ اور دھوئیں کی لپیٹ میں تھی۔ اطلاع ملتے ہی فائر بریگیڈ کا عملہ بھی پہنچ گیا۔ ایک طرف آگ بجھانے کی کوشش ہونے لگی اور دوسری طرف ایک کمرے کا دروازہ توڑ کر بچوں اور اس کے ماں باپ کو نکالنے کی جدوجہد شروع ہوئی۔ جس کمرے سے چیخنے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں وہ تیسری منزل میں تھا۔ گلی کی طرف کھلنے والی کھڑکیوں میں آہنی سلاخیں لگی تھیں اور بدقسمتی سے دروازہ باہر سے بند تھا۔

دھوئیں سے دم گھٹا جا رہا تھا اور آگ کی تپش سے جسم جھلس رہا تھا۔ فائر بریگیڈ والوں کی سیڑھی سے میں بھی اندر داخل ہو گیا۔ خوفزدہ بچّوں کی چیخوں سے ہر کسی کا کلیجہ شق ہوا چاہتا تھا۔ آگ ملحقہ کمرے تک پہنچ چکی تھی اور چند لمحوں کی تاخیر ان تین بچوں اور دو بڑوں کی جان لے سکتی تھی۔ میری پھرتیلی انگلیوں نے کام شروع کر دیا۔ میں نے فائر بریگیڈ کے ایک رکن کے ہاتھ سے پانی کی نالی پکڑ لی اور اس کی دھار کو باریک بنا کر چابی گھمانے کے سوراخ میں اس طرح پھینکا کہ کمانی پانی کے دباؤ کو برداشت نہ کر سکی، گھومی اور تالا کھل گیا۔ بچّوں اور ان کے ماں باپ کو نیم بیہوشی کی حالت میں باہر لایا گیا۔ بعد میں انھوں نے پولیس کو بتایا کہ ان کا ایک مخالف انھیں مقفّل کرنے کے بعد آگ لگا کر چلتا بنا تھا۔ میری ذہانت اور فن نے پانچ انسانوں کو از سرِ نو زندگی دی تھی۔ پولیس نے اعتراف کے طور پر مجھے نقد انعام اور ایک سند دی۔ مجھے بھی خوشی تھی کہ میرا فن انسانیت کی فلاح کے لیے کام آ رہا ہے۔

میرے فن کو اتنی شہرت ملی کہ جدھر سے بھی گزرتا، لوگ اشاروں سے ایک دوسرے کو مجھ سے متعارف کراتے ہیں۔ خوش تھا کہ دام بھی ملے اور نام بھی، لیکن ایک بار یہ شہرہ میرے لیے مصیبت کا باعث بن گیا۔ میں ایک رات اپنے کمرے میں بیٹھا ایک خاص قسم کے تالے کا جائزہ لے رہا تھا کہ دو آدمی اندر داخل ہوئے۔ دونوں نے اوور کوٹ پہنے ہوئے تھے۔ اپنی ٹوپیوں کو پیشانیوں پر اس طرح جھکایا ہوا تھا کہ ان کی آنکھیں صاف نظر نہیں آ رہی تھیں، ان میں سے ایک نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا:

مسٹر کورنٹے ہمیں آپ کی سخت ضرورت ہے، ایک سیف کا تالا کھولنا ہے، ابھی ساتھ چلیے۔"

"میں رات کو کہیں بھی باہر نہیں جا سکتا اور جب تک مجھے معلوم نہیں ہو جاتا کہ سیف کا مالک کون ہے، میں قانوناً تالا کھولنے کا مجاز نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"ہم ایک منٹ بھی انتظار نہیں کر سکتے۔ آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہی ہو گا۔ سیف میں ساٹھ ہزار ڈالر مقفل ہیں۔ تالا کھول دو تو دس ہزار آپ کو مل جائیں گے۔" دراز قامت آدمی نے کہا۔

"لیکن میں اس وقت نہیں جاؤں گا، خواہ مجھے کتنا ہی لالچ کیوں نہ دیا جائے۔" میں نے صاف جواب دیا۔

"تمھیں چلنا ہو گا اور تالا توڑنا ہو گا، ورنہ ہم تمھارا سر توڑ دیں گے۔" کوتاہ قد نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔

اس کے ساتھ ہی اس نے جیب سے پستول نکالا اور رُخ میری طرف کر دیا اور اس سے پہلے کہ میں حرکت کرتا دوسرا شخص اُچھل کر میری گردن پر سوار ہو گیا۔ اس نے میرے بالوں کو پکڑ لیا اور سر کو بے دردی کے ساتھ فرش پر پٹخنے لگا۔ میں لہولہان ہو گیا۔ دوسرے نے میری ناک پر زور کا مکّا رسید کیا۔ اس کے ساتھ ہی خون میرے حلق کے نیچے اُترنے لگا۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو جاؤں اور جب سڑک پر پہنچوں تو چیخنے چلّانے لگوں، لیکن ان کمبختوں نے تو مجھے بولنے کا موقع ہی نہ دیا اور اتنا مارا کہ میں بیہوش ہو گیا۔

مجھے ہوش آیا تو پولیس انسپکٹر مجھ پر جھکا ہوا تھا۔ اور وہ دونوں بدمعاش بھاگ چکے تھے۔

قریباً ایک ہفتے کے بعد ایک اور واقعے نے مجھے حیران کر دیا۔ شام کا وقت تھا، ایک خوبصورت جوڑے نے بجلی کی گھنٹی بجائی۔ میں باہر آیا تو انھوں نے بتایا کہ ابھی ابھی وہ تھیٹر دیکھ کر آئے ہیں۔ وہیں کہیں ان کے کمرے کی چابی گر گئی ہے، اس لیے میں ان کے ساتھ جا کر کمرے کا تالا کھول دوں۔ میں نے نیچے جھانک کر دیکھا۔ خوبصورت رولس رائس کار کھڑی تھی۔ میاں بیوی بھی باوقار اور خوبصورت تھے۔ میں کسی توقف کے بغیر ان کے ساتھ کار میں بیٹھ گیا۔ کار پارک ایونیو کے سامنے جا کر رُک گئی۔ یہ خوبصورت ایک منزلہ کوٹھیوں کا سلسلہ ہے اور ایک سپرنٹنڈنٹ کی نگرانی میں یہاں کرایہ دار رہتے ہیں۔ انھوں نے ایک بنگلے کے صدر دروازے کی طرف اشارہ کیا جس پر ایک مضبوط تالا لٹک رہا تھا۔ میرے ذہن میں اچانک ایک خیال پیدا ہوا کہ تالا کھولنے کے لیے سپرنٹنڈنٹ سے اجازت لے لینی چاہئے۔ میں نے جب ان دونوں کو یہ بات بتائی، تو انھوں نے پہلے اسے غیر ضروری قرار دینے کی کوشش کی اور جب میرا اصرار بڑھنے لگا، تو بادلِ ناخواستہ رضامند ہو گئے۔ میں سپرنٹنڈنٹ کے کمرے میں گیا، وہ اخبار پڑھ رہے تھے۔ میری طرف دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔

بنگلہ نمبر ۹ کی چابی گم ہو گئی ہے۔ مسٹر اور مسز برگلے تالا کھلوانا چاہتے ہیں، میں معروف قفل شکن چارلس کورنٹے ہوں، تالا کھولنے کے لیے میں آپ کی اجازت لینے آیا ہوں۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں ہاں کوئی حرج نہیں۔" سپرنٹنڈنٹ بولا، پھر وہ یکدم چونکا۔ "ٹھہرو! بنگلہ ۹ کے کرایہ دار تو نلوریڈا گئے ہوئے ہیں۔" سپرنٹنڈنٹ اور میں دونوں باہر آئے۔ بنگلہ ۹ کا صدر دروازہ بدستور مقفل تھا، لیکن رولس رائس اور اُس کا مالک خوبصورت جوڑا غائب تھے۔

میں نے اپنی زندگی میں بیشمار تالے کھولے ہیں، لیکن میں نے اس فن سے کبھی بھی ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا۔ میں اس وقت بھی نیویارک شپ یارڈ میں ملازم ہوں اور غالباً دنیا میں واحد لوہار ہوں جسے سرکاری طور پر غیر معمولی تنخواہ ملتی ہے۔ اور ہاں جس نیلگوں آنکھوں والی لڑکی کو اپنانے کے لیے میں نے تعلیم حاصل کرنے کا عزم کیا تھا، وہ اب میری رفیقۂ حیات ہے اور ہم دو خوبصورت بچوں کے ماں باپ ہیں۔ وہ میرے فن اور میری شہرت سے بے انتہا متاثر ہوئی اور پھر ایک اتوار کی صبح کو ایک چرچ میں ہم رشتۂ ازدواج سے منسلک ہو گئے۔

(اردو کے ایک ڈائجسٹ سے ماخوذ)

براتھ ویٹ
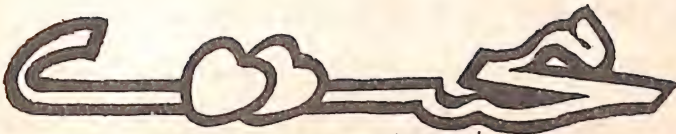
اردو کے ایک ڈائجسٹ کے شکریہ کے ساتھ

مسافروں سے بھری ہوئی بس نیو روڈ کے سٹاپ پر رکی اور میں اپنا ہینڈ بیگ سنبھالے ہوئے باہر آگیا۔ اس وقت میں کچھ گھبرایا ہوا تھا۔ بس میں بیٹھی ہوئی خواتین بار بار میری سیاہ رنگت کی طرف عجیب نظروں سے دیکھتی رہی تھیں۔ بہرحال بس سے اتر کر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر چاروں طرف نظر دوڑائی۔ اچھا! تو یہ تھا لندن کا مشرقی کنارا۔ چھوٹی چھوٹی تنگ گلیاں، اونچے اونچے قدیم مکان، جگہ جگہ کوڑے کے ڈھیر، بدبو کے بھبکے چھوڑتے ہوئے گٹر۔ بھنبھناتی مکھیاں، باسی پھولوں اور سبزیوں کی بساند، سخت مایوسی ہوئی۔ چکاچوند کر دینے والی روشنیوں کے اس شہر میں تنگ و تاریک گلیاں بھی ہیں، یہ میں جانتا ہی نہ تھا۔ گرینیز لیڈ سکنڈری اسکول کی عمارت پرانے طرز کی تھی، صحن نیم پختہ تھا اور عمارت کے پچھواڑے چھوٹے چھوٹے درختوں کے جھنڈ میں بھورے بالوں والا ایک چھوٹا سا لڑکا سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگا رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے سگریٹ کا ٹکڑا فوراً پھینک دیا اور میری طرف بڑھتے ہوئے بڑی بے تکلفی سے بولا:۔

"کیوں بھئی کس کو ڈھونڈ رہے ہو۔؟"

"میں ہیڈ ماسٹر مسٹر فلوریان سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"وہ سامنے سیڑھیاں نظر آ رہی ہیں نا۔ بس سیدھے وہاں چلے جاؤ۔"

یہ کہہ کر اس نے زمین پر پڑا ہوا سگریٹ کا ٹکڑا اٹھایا اور دوبارہ ہونٹوں میں دبا لیا۔

مسٹر فلوریان کی رنگت زیتون کی سی تھی۔ بال سفید ہو چکے تھے اور ٹھوڑی کے نیچے گوشت لٹک رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ مسکرایا:۔

"اخاہ! تو آپ مسٹر بریتھ ویٹ ہیں۔ تشریف رکھیے۔"

میں کرسی پر بیٹھ گیا۔

"اس سے پہلے کہ ہم آپس میں گفتگو کریں، بہتر یہی ہے کہ آپ ایک نظر سکول کو دیکھ لیں۔"

"دیکھ لیں گے، ایسی بھی کیا جلدی ہے۔" میں نے خوش اخلاقی سے کہا۔

"شاید آپ میرا مطلب نہیں سمجھے، یہ سکول دوسرے سکولوں سے خاصا مختلف ہے۔ اکثر نئے استاد کوشش کے باوجود یہاں کے مزاج کو نہیں سمجھ سکتے اور ناکام ہو کر رخصت ہو جاتے ہیں۔ آپ ذرا گھوم پھر کر کلاسوں کا جائزہ لیں۔ دوپہر کے کھانے پر ہم پھر ملیں گے۔"

یہ کہہ کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور دروازے تک میرے ساتھ آیا۔ طویل برآمدے کی دونوں جانب مختلف جماعتوں کے کمرے تھے — پہلے ہی کمرے کے سامنے میں رُک گیا۔ اندر جانے کی سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک ایک شور کے ساتھ دروازہ کھلا اور سُرخ بالوں والی ایک لمبی سی لڑکی تیزی سے باہر نکلی — دو اور لڑکیاں اس کے پیچھے پیچھے تھیں۔ شاید وہ اسے پکڑنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ تینوں کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ کپڑے میلے کچیلے تھے اور چہروں سے وحشت ٹپکتی تھی۔ اگلی لڑکی بری طرح چیخ رہی تھی۔ جلدی میں وہ مجھ سے ٹکرا گئی، میں نے اسے روکنے کی کوشش کی، لیکن اس نے دھکا دے کر مجھے ہٹا دیا اور صحن کی طرف بھاگ گئی۔ ابھی میں سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ پہلی لڑکی کا تعاقب کرتی ہوئی لڑکیاں مجھے دھکیل کر گزر گئیں۔ میں نے جیب سے رومال نکال کر پیشانی سے پسینہ پونچھا، کپڑوں کی گرد جھاڑی اور دروازہ کھول کر کلاس روم میں داخل ہو گیا۔ چالیس کے قریب لڑکے اور لڑکیاں بڑے مزے سے بنچوں پر بیٹھے گپیں ہانک رہے تھے۔ کچھ لڑکے ڈیسکوں کے اوپر چڑھے ہوئے تھے۔ چند لڑکیاں کھڑکیوں میں بیٹھی باہر جھانک رہی تھیں۔ لڑکیوں کے لباس بھڑکیلے اور تنگ تھے۔ لڑکوں نے تنگ پتلونیں اور ٹی شرٹیں پہنی ہوئی تھیں۔

پہلے پہل کسی نے میری طرف توجہ نہ کی، لیکن جب میں نے استاد کی کرسی سنبھال لی، تو آہستہ آہستہ شور کم ہو گیا اور سب لڑکے لڑکیاں مجھے عجیب نظروں سے دیکھنے لگے۔

"کیا آپ مسٹر میک مین سے ملنا چاہتے ہیں۔۔؟"

"وہ اسٹاف روم میں ہیں اور وہ یہ کہہ کر گئے ہیں کہ اگر ہم پڑھنا چاہیں تو انھیں بلالیں لیکن ہم پڑھنا نہیں چاہتے ۔" اس فقرے پر کلاس ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوگئی ۔ ایک لڑکی بولی : ۔

"کہیں آپ ان کی جگہ تو نہیں آئے — ؟"

"ہائیں — یہ کالا کلوٹا شخص ہمیں پڑھائے گا — نا بابا، اس سے تو گنجے مسٹر ہیک مین ہی بہتر تھے ۔"

"او کوے — اپنی چونچ دھو کر آؤ ۔"

"یہ منہ اور مسور کی دال ۔"

"کالیے — حبشی — کلوٹے ۔"

سب لڑکے لڑکیاں مجھ پر آوازے کس رہے تھے ۔ کلاس روم میں شور برپا تھا ۔ میں نے وہاں سے کھسکنے ہی میں مصلحت سمجھی ۔ برآمدے میں آکر میں نے بمشکل اپنے اوپر قابو پایا ۔ ان شیطانوں کی آوازیں اب تک کانوں میں زہر گھول رہی تھیں ۔

"کالیے — حبشی — کلوٹے ۔"

میں نے ایک سرد آہ بھری اور سٹاف روم کی طرف چل دیا، وہاں اسکول کے دوسرے استادوں سے ملاقات ہوئی ۔

"کہو کوئی کلاس پسند آئی ۔ ؟"

"میں ایک کلاس روم میں گیا تھا — وہاں لڑکوں نے بتایا کہ مسٹر ہیک مین ان سے ناراض ہو کر چلے گئے ہیں ۔" میں نے آہستہ سے کہا ۔

"ان کی کلاس نے انھیں اتنا تنگ کیا کہ بیچارے اسکول ہی چھوڑ گئے ۔" ایک استانی نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا ۔

دوپہر کے کھانے کے بعد میں ہیڈ ماسٹر مسٹر فلوریان سے ملنے گیا ۔ راستے میں آڈیٹوریم پڑتا تھا ۔ اندر سے موسیقی کی تیز دھنیں سنائی دیں ۔ میں نے اپنے ساتھی سے پوچھا : ۔

"یہ اندر کیا ہو رہا ہے ؟"

"لڑکیاں اور لڑکے ڈانس سے اپنا دل بہلا رہے ہیں ۔ کھانے کے بعد انہیں ایک گھنٹہ چھٹی ہوتی ہے ۔"

دروازہ کھول کر میں اندر چلا گیا ۔ پختہ فرش پر چار جوڑے اور پندرہ کے قریب لڑکے دو حصوں

کی طرح ناچ رہے تھے۔ ان کے چہرے سرخ ہو رہے تھے۔ اکثر کے منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا۔ ناچ کی تیزی میں انھیں تن بدن کا ہوش نہ تھا۔ دیوار کے ساتھ کچھ لڑکے لڑکیاں فرش پر ٹانگیں پسارے بیٹھے تھے۔

اچانک ایک لڑکی میرے پاس آکر بولی:-

"ہیلو ـــــ ناچ میں حصہ لوگے؟"

میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا، شاید یہ وہی لڑکی تھی جو برآمدے میں مجھے دھکا دے کر نکل گئی تھی۔

"جی نہیں بہت بہت شکریہ" میں نے اخلاق سے جواب دیا۔ لڑکی نے تمسخر کے انداز میں میری طرف دیکھا اور پھر اپنی اونچی ایڑیوں پر گھوم گئی۔

مسٹر فلوریان اپنے کمرے میں میرے منتظر تھے۔

"مسٹر براتھ ویٹ، امید ہے کہ آپ نے ہمارا اسکول ایک نظر دیکھ لیا ہوگا۔ اس سے پہلے کہ آپ پڑھانا شروع کریں، چند باتیں بتلا دینا ضروری سمجھتا ہوں، ہمارے اسکول کے تقریباً تمام طالب علم نچلے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ بچے ابتدائی اسکولوں سے یہاں آتے ہیں، تو سہمے سہمے اور خوف زدہ ہوتے ہیں۔ ہمارے یہاں سے فارغ ہو کر ان کی اکثریت عملی زندگی میں قدم رکھتی ہے۔ اس لئے ہمارے نزدیک کورس کی کتابیں رٹوانے سے کہیں زیادہ اہم کام یہ ہے کہ ان میں خود اعتمادی اور ہمت اور جرأت کے جذبات پیدا کئے جائیں تاکہ وہ اپنے آپ کو حقیر اور بے وقعت بچوں کے بجائے باہمت نوجوان محسوس کریں ـ لوگ ہمارے اسکول کے بارے میں زیادہ اچھی رائے نہیں رکھتے۔ ان کا خیال ہے کہ ہم بچوں کو بدتمیز اور گستاخ بنا دیتے ہیں، لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اگر غریب اور نادار بچوں پر سختی کی جائے، تو وہ اور زیادہ جھینپو اور ڈرپوک ہو جائیں گے اور زندگی میں کبھی کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ لہٰذا ایک بات ذہن نشین کر لیجیے کہ جسمانی سزا اور مار پیٹ تو ایک طرف رہی، ہم بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ بلانا بھی نامناسب سمجھتے ہیں۔ اکثر استاد یہاں سے ناکام ہو کر جاتے ہیں، اس لئے کہ وہ بچوں سے محبت کے بجائے سختی کا سلوک روا رکھنے کے عادی ہوتے ہیں ـــ بچوں سے محبت کیجیے، وہ آپ سے محبت کریں گے۔ ہمارا ایمان ہے کہ محبت سب سے بڑی طاقت ہے۔"

میرے کانوں میں ان کے الفاظ گونجتے رہے اور آنکھوں کے سامنے دن بھر کے مناظر ـــ لہراتے رہے۔

"ایک بات اور ـــ آپ دیکھیں گے کہ ان بچوں میں سے اکثر بدتمیز اور بیہودہ ہیں۔ وہ سگریٹ

پیتے ہیں اور فحش گالیاں بکتے ہیں، ان کا لباس بھی نہایت واہیات ہوتا ہے، لیکن یہ آپ کو سب کچھ برداشت کرنا پڑے گا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ان کی اصلاح نہیں ہونی چاہیئے، میرا مقصد صرف یہ ہے کہ انھیں محبت سے سمجھانے کی ضرورت ہے۔ جب وہ ناپسندیدہ فعل کے مرتکب ہو رہے ہوں، ان پر ناراضگی کا اظہار کرنا نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے، کیونکہ وہ اس طرح ضدی اور ہٹ دھرم بن جائیں گے ــــ چشم پوشی سے کام لیجیے اور بعد میں مناسب طریق سے انھیں بُرے کام کا نقصان جتلا دیجیے۔ ان بچوں کو آپ کی محبت کی ضرورت ہے، کیونکہ ان کے ننّھے مُنّے ذہنوں نے ماحول سے نفرت کے سوا کچھ نہیں پایا۔"

"آپ کل سے کام شروع کر دیجیے۔ ایک بار پھر کہوں گا کہ جن بچوں کو آپ پڑھانے والے ہیں وہ نہایت معصوم اور پیارے بچّے ہیں ــــ اگر ان سے کوئی بھول ہو جائے، تو انھیں ڈانٹیے نہیں ورنہ وہ بگڑ جائیں گے ــــ کسی قسم کی تکلیف ہو تو مجھ سے کہیئے میں آپ کی ہر ممکن مدد کرنے کے لئے تیار ہوں۔"
یہ کہہ کر اس نے بڑی گرمجوشی سے میرا ہاتھ دبایا اور ہم اُٹھ کھڑے ہوئے۔

سہ پہر میں نے ایک استانی مسٹر ڈریو کے ساتھ گزاری۔
مسز ڈریو نے مجھے ٹائم ٹیبل بتایا، کورس کی کتابیں دکھائیں اور بعض ضروری باتوں سے آگاہ کیا۔ شام کو گھر جانے کے بعد بس پر سوار ہوا، تو ذہن میں بہت سے خیالات کا ہجوم تھا۔ مسٹر فلوریان کی گفتگو رہ رہ کر یاد آ رہی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ بچّے بہت معصوم اور پیارے ہیں۔ انہی معصوم اور پیارے بچوں نے میرے آنے سے ذرا دیر پہلے مسٹر ہیک مین کو دن میں تارے دکھا دیے تھے ــــ "کالئے ــــ حبشی کلوٹے ــــ" کے الفاظ ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ عام حالات میں شاید میں یہ بے عزتی کبھی برداشت نہ کرتا، لیکن مجھے ملازمت کی بہت سخت ضرورت تھی۔ ایک مدّت سے میں بیکار تھا اور یہ تہیہ کر چکا تھا کہ خواہ کیسی ہی ملازمت کیوں نہ ملے، میں فوراً قبول کر لوں گا ــــ آج سے چار سال قبل میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں ایک اسکول ماسٹر بنوں گا۔ میرے پاس الیکٹرونک انجینئرنگ کا ڈپلوما تھا۔ میں رائل ایرفورس میں انجینئر تھا۔ میں نے جنگ عظیم کے آغاز ہی میں اپنے آپ کو رضاکارانہ طور پر فوج کی خدمت میں پیش کر دیا تھا۔ جنگ کے بعد جب ہنگامی عملے کی تطہیر شروع ہوئی، تو میں بھی اس کی لپیٹ میں آگیا۔ میرے پاس سائنس کی ایک اعلیٰ ڈگری بھی تھی اور انجینئرنگ کے میدان میں کئی سال تجربہ بھی ــــ تطہیری مرکز میں ایک شخص نے، جو میکانکی انداز میں ہر شخص کے لئے سول کی ملازمتیں تجویز کر رہا تھا، میرے کاغذات دیکھ کر کہا:۔

"مسٹر براتھ ویٹ، حقیقت یہ ہے کہ مالی طور پر آپ گھاٹے میں نہیں رہے۔ آجکل بے تحاشا کارخانے کھل رہے ہیں اور تجربہ کار انجینئروں اور ٹیکنیکوں کی ہر جگہ ضرورت ہے۔ آپ کو تو لوگ ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔"

وہ ٹھیک ہی کہتا تھا۔ اگلے ہفتے مجھے تین کمپنیوں کی طرف سے انٹرویو کی دعوت موصول ہوئی۔ تیسرے دن میں پہلی فرم کے دفتر پہونچ گیا۔ دروازے پر بیٹھے ہوئے چپراسی نے شیشے کا بڑا سا دروازہ کھولا اور میں ہال کمرے میں داخل ہوگیا ــــ لیڈی سکریٹری کے پاس جاکر میں نے خوش اخلاقی سے کہا:

"صبح بخیر، میرا نام براتھ ویٹ ہے، مجھے مسٹر سمینڈ نے انٹرویو کے لئے بلایا ہے۔"

اس روز میں نے انٹرویو کے لئے خوب تیاری کی تھی۔ میں اپنا بہترین سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ میرے جوتے اچھی طرح پالش کئے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود جونہی لیڈی سکریٹری نے رجسٹر سے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا، اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ اس نے ریسیور اٹھایا اور آہستہ سے کچھ کہا۔

"آؤ میرے ساتھ۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہم کئی برآمدوں میں سے گزر کر ایک کمرے کے سامنے پہنچے۔ مجھے اس جگہ چھوڑ کر وہ واپس چلی گئی۔ میں نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ اندر سے ایک بھاری بھرکم آواز سنائی دی:

"اندر آجائیے۔"

میں نے دروازہ کھولا اور اندر چلا گیا۔

ایک لمبی سی میز کے پیچھے چار آدمی دکھائی دے رہے تھے۔ مسٹر سمینڈ شاید دائیں جانب بیٹھے تھے، کیونکہ وہ مجھے دیکھ کر سب سے پہلے انھوں نے اٹھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا تھا۔ اپنے ساتھیوں سے تعارف کرانے کے بعد انھوں نے مجھے بیٹھنے کے لئے کہا۔ ان کے ساتھی مجھ پر سوالات کرنے لگے۔ میں نے ہر سوال کا معقول جواب دیا۔ بعض سوال تو سرے سے غلط تھے، یوں معلوم ہوتا تھا جیسے خود سوال کرنے والوں کو الیکٹرونک انجینئرنگ کے بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہیں، بیس منٹ تک یہ انٹرویو جاری رہا۔ پھر مسٹر سمینڈ نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا، تینوں نے سر کے اشارے سے انھیں کچھ سمجھایا شاید وہ میرے متعلق کسی نتیجے پر پہنچ گئے تھے۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد مسٹر سمینڈ نے بات شروع کی:

"مسٹر براتھ ویٹ، ہم آپ سے پوری طرح مطمئن ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جہاں تک تعلیمی قابلیت اور تجربے کا تعلق ہے، آپ اس عہدے کے لئے موزوں ہیں، جس کے لئے ہم نے آپ کو بلایا ہے، لیکن ایک مشکل ایسی ہے جس کا حل بہت مشکل ہے۔ دیکھئے نا، اگر ہم آپ

کو الیکٹرونکس انجینیر رکھ لیں، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کم و بیش دو سو انگریز ملازمین آپ کے ماتحت کام کریں گے۔ یہ لوگ ہمارے پاس سالہا سال سے ملازم ہیں اور ہمارے تعلقات ان سے بہت خوشگوار ہیں، معاف کیجیے آپ کی ماتحتی شاید وہ قبول نہ کریں گے۔ ویسے ہمارے یہاں کچھ ایسی جگہیں ہیں جہاں آپ الگ تھلگ کام کر سکتے ہیں، لیکن آپ کی تعلیم اور تجربہ بہت زیادہ ہے، وہ تو معمولی مکینکوں کی آسامیاں ہیں۔ ہم معذرت چاہتے ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنا ہاتھ مصافحے کے لئے بڑھا دیا۔ میری آنکھوں کے آگے جیسے اندھیرا سا چھا گیا تھا۔ میں نے جلدی سے مصافحہ کیا اور باہر آگیا۔ چھ سال کے عرصے میں یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے اپنی کالی رنگت کا اتنی شدّت سے احساس ہوا۔ ۱۹۴۰ء میں جب میں نے اپنے آپ کو رضا کار کی حیثیت سے فوج کے سامنے پیش کیا، تو کسی نے اس رنگت پر اعتراض نہ کیا۔ جنگ کے دنوں میں جب رائل ایر فورس کی وردی پہنے بازاروں میں نکلتا تھا، تو کبھی کسی نے مجھے نفرت کی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ جب میں پہلے پہل برطانیہ میں آیا تھا، تو ذہن میں اس ملک کے بارے میں بہت اچھے خیالات تھے یہاں آزادی تھی، وقار تھا اور انسانی مساوات تھی۔ کم از کم کتابوں میں تو میں نے یہی پڑھا تھا۔ یہ مہذّب لوگوں کا ملک تھا، لیکن فوج سے نکل کر چند ہی دنوں میں مجھے یہ محسوس ہوگیا کہ یہ سب کتابی باتیں ہیں۔ فرد کی حریت اور آزادی کے لئے میں نے اپنی جان تک پیش کر دی تھی، وہ ایک ڈھونگ تھا۔ جمہوریت اور انسانی حقوق کے علمبردار درحقیقت گھناؤنی اور گھٹیا قسم کی طبقہ پرستی کے شکار تھے مجھے اپنے اوپر غصہ آرہا تھا، میں نے ان لوگوں پر اعتماد کیا تھا۔ میں نے ان کی خاطر اپنی جان تک جنگ کی آگ میں جھونک دی تھی، لیکن یہ قوم کتنی مطلب پرست تھی۔ ضرورت کے وقت یہ لوگ گدھے کو بھی اپنا باپ بنانے میں جھجک محسوس نہیں کرتے تھے، مگر جب ضرورت پوری ہو جاتی، تو یہی شخص ان کے لئے مکھن کا بال بن جاتا جسے وہ اپنی فطری "صفائی پسندی" کی وجہ سے فوراً باہر نکال دیتے تھے۔ راستے میں ایک جگہ رک کر میں نے باقی دو فرموں کو فون کیا اور تعلیمی قابلیت اور تجربے کے ساتھ ساتھ واضح طور پر یہ بتا دیا کہ میں ایک حبشی ہوں۔ مجھ میں خود انٹرویو کے لئے جانے کی ہمت نہ تھی۔ خیال تھا کہ شاید کوئی فرم رنگ اور نسل کے بجائے صرف کام سے غرض رکھتے ہوئے مجھے ملازم رکھ لے، لیکن دونوں جگہوں سے ٹکا سا جواب مل گیا۔ افسردہ اور پریشان حال میں ٹیلی فون بوتھ سے باہر نکلا اور سڑک کے کنارے کنارے سمت کا تعیّن کئے بغیر چل دیا۔

دن گزرتے چلے گئے، لیکن مجھے کہیں ملازمت نہ مل سکی۔ دفتر روزگار کے چکّر کاٹ کاٹ

کر میں مایوس ہوگیا۔ کوئی فرم ایک حبشی کو چیف انجینیر کے عہدے پر قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھی۔ ایک روز اخبار میں ایک اشتہار بھی دیا کہ میں ایک حبشی ہوں اور ملازمت چاہتا ہوں۔ ساتھ ہی اپنی ڈگریاں اور عملی تجربے کی تفصیلات بھی دیں، مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ کچھ عرصے بعد حالات مجھے گرینز لیڈ کے اسکول میں لے گئے جہاں ہیڈ ماسٹر نے مجھے ان بچوں سے محبت کرنے کی نصیحت کی جنہوں نے مجھ پر کالئے اور کلوٹے کے آوازے کسے تھے۔

* * *

رات کے وقت بستر پر لیٹ کر میں نے صورت حال پر غور کیا۔ میرے سامنے دو ہی صورتیں تھیں اسکول کی ملازمت صرف اس صورت میں کامیاب ہو سکتی تھی۔ جب میں ان بچوں پر اپنی تمام محبت اور شفقت نچھاور کردوں جو ایسی قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ جس کو مجھ سے سخت نفرت تھی۔ یہ کام میرے لئے بہت مشکل تھا ـــــ قدرتی طور پر میں ان گورے بچوں سے خوف زدہ تھا۔ دوسری صورت یہ تھی کہ میں اسکول کی ملازمت ترک کردوں، ورنہ میرا حشر بھی مسٹر ہیک مین جیسا ہوگا۔ وہ انگریز ہونے کے باوجود بچوں کے ہاتھوں پٹ گئے تھے۔ میری دال وہاں کیسے گل سکتی تھی۔ اچانک ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ آج کے بچے کل کے بڑے۔ اگر میں ان بچوں پر یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو جاؤں کہ رنگ روپ اور نسل کی تخصیص بیکار ہے، اصل چیز انسان کا کردار اور شخصیت ہے، تو یہ ایک بہت بڑا کارنامہ ہوگا ـــــ میں دیر تک سوچتا رہا اور آخر میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں ان گستاخ اور بدتمیز بچوں کی محبت جیت لوں گا، خواہ اس کے لئے مجھے اپنا سب کچھ کیوں نہ قربان کرنا پڑے۔ میں ایسے معاشرے کی تشکیل کے لئے ہر ممکن کوشش کروں گا۔ جہاں کوئی مالک مکان صرف اس لئے کسی غیر ملکی کو مکان دینے سے انکار نہیں کرے گا کہ اس کا رنگ کالا ہے کالے لوگ گوروں سے زیادہ مہذب، با اخلاق، محنتی، مخلص اور صاف ستھرے ہو سکتے ہیں۔ یہ سوچ کر کہ اب میں اپنے لئے نہیں، بلکہ اپنی قوم کے لئے لڑوں گا، مجھے دلی خوشی ہوئی۔ انہی خیالوں میں گمن میں نیند کی دنیا میں پہنچ گیا۔

پہلے روز کلاس روم کا دروازہ کھولتے وقت میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ بڑی مشکل سے اپنے اوپر قابو پایا اور اندر چلا گیا۔ یہ وہی کلاس تھی جسے مسٹر ہیک مین چھوڑ کر گئے تھے اور جہاں مجھے کلوٹے کا خطاب ملا تھا۔ کرسی پر بیٹھ کر میں لڑکوں اور لڑکیوں کے خاموش ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر تو وہ آپس میں باتیں کرتے رہے، لیکن آہستہ آہستہ خاموشی چھا گئی اور سب میری

طرف کچھ اس طرح دیکھنے لگے جیسے چڑیا گھر میں کسی جانور کو دیکھ رہے ہوں۔ حاضری لینے کے بعد میں نے اپنا تعارف کرایا اور پھر نپے تُلے لفظوں میں کہا:

" اس سے پہلے کہ میں کتاب پڑھنا شروع کروں، آپ میں سے کوئی صاحب مجھے پڑھ کر سنانا پسند کریں گے؟ میں رجسٹر سے نام بولتا ہوں۔" پاٹر پہلا لڑکا تھا جس کا میں نے نام لیا۔ اس کے بعد کئی لڑکوں اور لڑکیوں نے کتاب پڑھی۔ سب کے تلفظ انتہائی غلط تھے، وہ سادہ سے سادہ فقروں کا مطلب نہ بتا سکے۔ صرف ایک لڑکی نے عبارت ٹھیک سے پڑھی، وہ پامیلا ڈیر تھی۔ جب وہ پڑھ رہی تھی، تو کلاس کے پچھلے حصے سے دبی دبی ہنسی کی آواز آئی۔ آہستہ آہستہ آواز بلند ہوتی چلی گئی، میں اپنی جگہ سے اُٹھ کر پیچھے گیا، ایک لڑکا ربر کی بنی ہوئی چھوٹی سی عورت لئے بیٹھا تھا اور بڑی نازیبا حرکات کر رہا تھا۔ میرا خون کھول اُٹھا۔ میں نے دانت بھینچ کر اپنے اوپر قابو پایا اور لڑکے سے کہا:

" براہ کرم آپ اس چیز کو ڈیسک میں رکھیں۔"

لڑکے نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور وہ بیہودہ سی چیز ڈیسک میں رکھ دی، میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا:

" مجھے آپ لوگوں کا تلفظ سن کر بہت افسوس ہوا ہے۔ آپ اسکول کی سب سے بڑی جماعت ہیں۔ چند ماہ میں آپ تعلیم سے فارغ ہو جائیں گے اور عملی زندگی میں قدم رکھیں گے۔ آپ جہاں کہیں بھی جائیں، آپ کو انٹرویو دینا پڑے گا اور اگر آپ کی زبان میں غلطیاں ہوئیں تو شاید ہی کوئی فرم ایسی ہو جو آپ کو قبول کر سکے۔ براہ کرم، اپنے مستقبل کا خیال رکھئے اور تلفظ پر دھیان دیجیے اور دیکھئے اب آپ بچے نہیں رہے، بلکہ ذمہ دار اور بالغ انسان ہیں۔"

پہلا دن گزر گیا۔ سبق کے دوران میں اکثر لڑکے آوازے کستے رہے، لیکن میں نظر انداز کرتا رہا۔ کتاب سننے کے بعد میں نے وزن اور لمبائی کے پیمانے سنے اور پھر عام معلومات سے متعلق چند سوالات کیے۔ اس دوران میں کلاس میں طالب علموں کے چہروں پر ناگواری کے آثار نمایاں تھے۔ اکّے دکّے آوازے سنائی دیتے رہے، تاہم مجموعی طور پر کوئی ناگوار حادثہ نہیں ہوا۔ پہلے ہی دن میں نے اندازہ کر لیا کہ کون کون سے لڑکے شرارتوں کا مرکز ہیں۔ شریر لڑکے اور لڑکیاں زیادہ تر پچھلی بنچوں پر بیٹھتے تھے اور سبق کے دوران میں منہ نیچے کر کے ہنستے تھے۔ چھٹی کی گھنٹی بجی، تو میں اُٹھا۔ میری موجودگی کو نظر کرتے ہوئے کلاس بے تماشا شور مچانے لگی۔ پہلے تو جی میں آئی کہ ایک ڈانٹ پلاؤں، لیکن پہلا دن ہونے کی وجہ سے خاموش ہو گیا۔

گرینیز لیڈ اسکول میں ایک مدت سے یہ قاعدہ چلا آتا تھا کہ ہر جمعے کی سہ پہر کو تمام طلبا ہفتے بھر کی خاص خاص باتیں مضمون کی صورت میں لکھتے تھے۔ مسٹر فلوریان کا خیال تھا کہ اس طرح اسکول استادوں اور کتابوں کے بارے میں طلبا کی تازہ ترین رائے سے باخبر رہا جا سکتا ہے۔ پہلے جمعے کو میں نے بڑی احتیاط سے اپنی جماعت کی کاپیاں دیکھیں۔ یہ دیکھ کر قدرے مایوسی ہوئی کہ بہت کم لڑکے لڑکیوں نے میرے بارے میں تفصیل سے کچھ لکھا تھا۔ تقریباً ہر کاپی پر مختصر لفظوں میں ایک نئے ماسٹر کی آمد کا ذکر تھا جو کالا تھا اور سب لڑکوں کو "آپ" کہہ کر بلاتا تھا۔ اس سے زیادہ کسی نے کچھ نہیں لکھا تھا۔ شاید ان کا خیال تھا کہ میں بھی دوسرے کئی استادوں کی طرح دو چار روز کا مہمان ہوں۔ خواہ مخواہ میرے بارے میں سوچ کر وقت کیوں ضائع کیا جائے۔

آج جب میں ان دنوں کو یاد کرتا ہوں، تو واضح طور پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ طلبہ سے میرے تعلقات تین ادوار سے گزرے۔ شروع میں لڑکے لڑکیاں خاموشی سے مجھے دیکھتی رہیں۔ شاید وہ یہ فیصلہ کر رہے تھے کہ مجھ سے کس قسم کا سلوک روا رکھا جائے۔ اس دوران میں اُنھوں نے ہر کام بڑی بیزاری اور لاتعلقی سے کیا۔ دوسرا دور میرے لئے پہلے سے کہیں زیادہ مشکل کا باعث تھا۔ آہستہ آہستہ وہ شور کرنے لگے۔ میں کتاب پڑھ رہا ہوتا، تو کوئی لڑکا زور سے اپنی ڈیسک بند کرتا۔ میں سر اُٹھا کر کلاس پر نظر ڈالتا، تو سب کے چہروں پر زہر خند مسکراہٹ ہوتی۔ خون کے گھونٹ پی کر دوبارہ کتاب شروع کرتا، لیکن کسی کونے سے ہنسی ابھرتی، پھر جوتوں کی فرش پر ٹھپ ٹھپ سنائی دیتی۔ انھیں کبھی چھینکیں آنے لگتیں، تو کبھی مصنوعی کھانسی کے دورے پڑتے۔ میں چپ چاپ یہ سب کچھ برداشت کر رہا تھا۔ اصل میں کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھا۔ سرگوشیاں، دبی دبی ہنسی، آوازے، لاتعلقی اور سوالوں کے الٹے سیدھے مضحکہ خیز جوابات، یہ سلوک مجھے پریشان کرنے کے لئے کافی تھا، لیکن میں نے ہمت نہ ہاری اور یہ ظاہر کرتا رہا۔ جیسے مجھے کچھ علم ہی نہیں کہ آہستہ آہستہ وہ شیر ہوتے چلے گئے یہاں تک کہ وہ کلاس روم میں ایک دوسرے کو گالیاں دی جانے لگیں۔ ایک روز تو یہ معاملہ انتہا کو پہنچ گیا۔ میں کلاس روم میں داخل ہوا، تو چند لڑکے لڑکیاں ڈیسکوں کے درمیان ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈالے ناچ رہے تھے اور ساتھ میں نازیبا حرکات کے مرتکب ہو رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر کچھ تو اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے لیکن ایک جوڑا بدستور ناچ میں مصروف رہا۔ میں نے قریب جا کر بڑی نرمی سے کہا:

"یہ کلاس روم ہے، ناچ گھر نہیں۔ براہ کرم اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھ جائیے۔"

"کیسے بیٹھ جائیں، ناچ ختم کرنے کو ہمارا ابھی نہیں چاہتا ۔" لڑکے نے بڑی ڈھٹائی سے کہا۔ اس فقرے پر کلاس میں فلک شگاف قہقہے بلند ہوئے۔

میری آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اچانک لڑکی کی نظر میری طرف اُٹھ گئی۔ اس نے آہستہ سے اپنے آپ کو لڑکے کی گرفت سے آزاد کیا اور سیٹ پر بیٹھ گئی۔ میرا سر چکرا رہا تھا جوں توں کر کے پیریڈ ختم کیا اور سٹاف روم میں جا کر چائے پینے لگا۔ واپس آیا، تو تمام لڑکے، لڑکیاں آتش دان کے گرد جمع تھے اور دھویں سے سارا کمرہ بھرا ہوا تھا، میں نے قریب جا کر دیکھا، دہکتے ہوئے کوئلوں پر ایک ایسی چیز جل رہی تھی جسے دیکھ کر ایک لمحے کے لئے میں خود چکرا گیا۔

"سب لڑکے باہر چلے جائیں۔" میں نے تقریباً چیخ کر کہا۔ قہقہے رک گئے اور کلاس روم میں سناٹا چھا گیا۔ "میں کہتا ہوں سب لڑکے باہر چلے جائیں۔" میں نے دوبارہ کہا، لڑکے فوراً ہی اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور خاموشی سے باہر چلے گئے۔ لڑکیوں کو جمع کر کے میں نے خوب لتاڑا، غصے کے عالم میں الفاظ میرے منہ سے ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہے تھے۔ لڑکیاں خوف زدہ تھیں اور سر جھکائے بیٹھی تھیں۔

"آپ کو اس قسم کی حرکتیں کرتے ہوئے شرم آنی چاہئے۔ کیا آپ اپنے کپڑے بھی سنبھال کر نہیں رکھ سکتیں۔ یہ آخری موقع ہے، اگر آئندہ میں نے ایسی کوئی حرکت دیکھی، تو میں کسی کو معاف نہیں کروں گا۔ یہ مت سمجھو کہ میں کچھ نہیں جانتا۔ پچھلے دو ہفتوں سے میں سب کچھ دیکھ رہا ہوں، میں محض آپ لوگوں کو آزمانا چاہتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ آپ خود بخود سمجھ جائیں گی، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ سیدھی انگلیوں سے گھی نہیں نکلے گا۔"

میں خاصی دیر تک بولتا رہا، یہاں تک کہ بعض لڑکیاں رونے لگیں۔ ایک لڑکی نے اُٹھ کر کہا:۔

"سر ہم بہت شرمندہ ہیں، آئندہ ایسی کوئی حرکت نہیں ہو گی۔ اس مرتبہ آپ ہمیں معاف کر دیجیئے۔"

"ٹھیک ہے میں اسٹاف روم سے ہو کر آتا ہوں، اس دوران میں آپ آتش دان کو صاف کریں اور کھڑکیاں کھول دیں تاکہ دھواں باہر نکل جائے۔ ایک لڑکی جا کر لڑکوں کو بُلا لائے۔" یہ کہہ کر میں باہر نکل گیا۔

اس روز سے لڑکیوں کا رویہ بدل گیا، وہ بہت دھیان سے میری باتیں سننے لگیں لیکن

لڑکوں کا سلوک بدستور وہی تھا۔ بعض اوقات تو ان کی بدتمیزیاں انتہا کو پہنچ جاتیں۔ کالے اور حبشی کے آوازے اب ختم ہو گئے تھے۔ شاید وہ لوگ خود ہی اس مذاق سے تنگ آ گئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ میں لفظ کالے سے چڑوں گا، لیکن میری خاموشی نے انھیں مایوس کر دیا تھا۔ آخر ایک روز مجھے اپنا وجود تسلیم کروانے کا موقع مل گیا، کھیلوں کا پیریڈ تھا۔ کلاس کا سب سے شریر لڑکا ڈینہم مکہ بازی کی مشق کر رہا تھا۔ باقی کلاس اسے دیکھ رہی تھی، جونہی میں قریب سے گزرا ڈینہم بولا:

"سر آیئے دو دو ہاتھ ہو جائیں۔"

"شکریہ" میں نے زبردستی مسکرا کر کہا:

"ڈر گئے" پیچھے کھڑے ہوئے کسی لڑکے نے آوازہ کسا۔ میں فوراً پلٹ آیا۔ اس سے پہلے میں نے کبھی مکہ بازی میں حصہ نہیں لیا تھا۔ میں اس کھیل کے ابجد سے ناواقف تھا۔ لیکن اب انھوں نے میری ذات کو چیلنج کیا تھا۔ خاموش رہنے کا مقصد یہ تھا کہ میں جسمانی طور پر لڑکوں سے خوفزدہ ہوں۔ میں نے دستانے پہنے اور میدان میں اتر آیا، شور سے سارا ہال گونج اٹھا۔

"آج کالا پٹ گیا۔" یہ الفاظ سن کر میں نے تہیہ کر لیا کہ جیسے بھی ہو، ڈینہم کو نیچا دکھاؤں گا۔ ڈینہم موٹا تازہ پلا ہوا لڑکا تھا اور مکہ بازی میں بھی ماہر تھا۔ پہلے راؤنڈ میں اس نے مجھے دو ضربیں لگائیں اور میں کوشش کے باوجود جواب نہ دے سکا۔ کلاس کا شور آسمان تک پہنچ رہا تھا سب لڑکے ڈینہم کو شاباش دے رہے تھے۔ دوسرے راؤنڈ کے آغاز ہی میں میں نے جوابی حملے شروع کر دیئے۔ اب میں کچھ تجربہ کار ہو گیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر میں مکہ بازی میں ہار گیا تو سکول میں رہنا ناممکن ہے۔ جانے اس وقت مجھ میں اتنی پھرتی کہاں سے آ گئی۔ دوسرے راؤنڈ کے خاتمے پر میں ڈینہم کو پانچ گھونسے رسید کر چکا تھا۔ آخری ضرب پر تو وہ چکرا کر فرش پر گرا اور اس کے منہ سے خون بہہ نکلا۔ پورے ہال پر سناٹا طاری تھا۔ تمام لڑکے اور لڑکیاں خاموش کھڑی تھیں۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا اور دستانے اتارے اور ایک لڑکے کو پانی لانے کے لئے کہا۔ پانی پینے کے بعد ڈینہم کے اوسان بحال ہوئے۔ میں نے خیریت دریافت کی، اس نے سر جھکا کر کہا:—

"اچھا ہوں۔" اس دوران میں گھنٹی بج گئی اور سب طلبہ اپنی اپنی جماعتوں میں چلے گئے۔

اس واقعہ کا طلبہ پر بہت اثر ہوا۔ انھیں معلوم ہو گیا کہ میں کمزور شخصیت نہیں ہوں اور وقت آنے پر ان کی اچھی خاصی پٹائی کر سکتا ہوں، تاہم اس نے اپنے رویئے میں کوئی تبدیلی نہ کی اور بدستور محبت اور شفقت سے پیش آتا رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس اسکول میں درسی کتابوں کو

زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔ اس لیئے میں چھوٹے چھوٹے مباحثے اور مقابلے کرواتا۔ کھیلوں میں دلچسپی لیتا، طلبا کے چھوٹے موٹے مسائل میں ہاتھ بٹاتا۔ صفائی کی اہمیت پر زور دیتا۔ خود ہر روز صاف ستھرے کپڑے پہنتا تا کہ طلبہ میں صفائی کا احساس پیدا ہو۔ ایک روز میں کلاس لے رہا تھا کہ اچانک دروازہ کھلا اور جوزیفائن ہانپتی کانپتی ہوئی اندر آئی۔ دیر سے آنے کی وجہ سے وہ پسینے پسینے ہو رہی تھی۔ اس نے دروازہ اتنے زور سے کھولا تھا کہ ہم سب ایک بار تو ڈر ہی گئے۔ میں نے نہایت نرمی سے کہا:۔

"مس جوزیفائن ابھی جس طرح اندر آئی ہیں، وہ طریقہ ایک باوقار خاتون کے شایان شان نہیں۔ میں ان سے درخواست کروں گا کہ وہ دوبارہ باہر جائیں اور صحیح طریقے سے کلاس روم میں داخل ہونے کا مظاہرہ کریں۔"

جوزیفائن کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا، وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور پاؤں پٹختی ہوئی باہر چلی گئی۔ ایک منٹ بعد دروازہ کھلا، جوزیفائن آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اپنی سیٹ تک آگئی اور اطمینان سے بیٹھ گئی۔ میں نے اسے شاباش دی۔ کلاس اب مجھ سے خاصی مانوس ہو گئی تھی۔ صرف چند شریر لڑکے ابھی تک شرارتوں سے باز نہیں آئے تھے۔ ایک روز مجھے معلوم ہوا کہ جینی بیمار ہے۔ چھٹی کی گھنٹی بجی، تو میں نے تجویز پیش کی کہ اس کی عیادت کو چلنا چاہیئے۔ سب حیران رہ گئے۔ پاٹر بولا:۔

"ہمیں کیا مصیبت پڑی ہے کہ سینٹ لوئیس کے گندے محلے میں مارے مارے پھریں۔"

"پاٹر یہ الفاظ تمہیں نہیں کہنے چاہئیں۔ خدا نہ کرے اگر تم بیمار پڑ جاؤ، تو....."

پاٹر خاموش ہو گیا۔ چھیالیس طلبہ کی جماعت میں سے صرف تین لڑکیاں اور دو لڑکے میرے ساتھ جانے پر رضامند ہوئے میں نے یہی غنیمت جانا اور انھیں ساتھ لے کر جینی کے گھر چلا گیا۔ اسے معمولی بخار تھا، وہ ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ دیر تک ہمارا شکریہ ادا کرتی رہی۔ میں نے اسے تسلّی دی کہ شکریہ ادا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

بعض لڑکے ابھی تک مجھ پہ آوازے کستے تھے۔ ان میں بلنکر ڈ یمش پیش تھا۔ وہ موقع بے موقع مجھے سیاہ فام ہونے کا طعنہ دیتا رہتا۔ ایک روز میں سبق پڑھا رہا تھا کہ وہ بولا:

"سر بلیکی کسے کہتے ہیں؟"

میں موزوں جواب سوچ رہا تھا کہ پامیلا ڈیر کی غصے میں بھری ہوئی آواز بلند ہوئی۔

"بلنکرڈ۔ تمہیں شرم آنی چاہئے۔ اپنی شکل دیکھی ہے کبھی تم نے ــ لنگور کہیں کے۔"
بلنکرڈ جو بچکا سا رہ گیا ــ قریب تھا کہ کلاس میں ہنگامہ اُٹھ کھڑا ہو۔ میں نے سب کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور کہا:ــ
"مس ڈیر نے ابھی ابھی اعتراض کیا ہے کہ بلنکرڈ اور اس کے بعض ساتھی میری رنگت کا مذاق کیوں اڑاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے کبھی اس سے بُرا نہ مانا اور اس میں بُرا ماننے کی بات ہی کیا ہے۔ آپ سب لوگ سفید ہیں اور میں کالا۔ آپ کو میری رنگت واقعی عجیب لگتی ہوگی۔ لیکن یقین جانئے کہ ہمارے ہاں اگر آپ میں سے کوئی چلا جائے، تو لوگ اسے قدرت کا عجوبہ سمجھیں گے۔ میں آپ کو اپنے بچپن کا ایک واقعہ سناتا ہوں۔ ہمارے گھر کے قریب ہی ایک انگریز فیملی رہتی تھی۔ ان کا ایک ننھا سا بچہ تھا۔ سُرخ سُرخ چقندر کی طرح۔ ایک بار میں گھر سے باہر نکلا، تو لڑکوں نے اسے گھیر رکھا تھا۔ وہ اس کی سُرخ سفید رنگت کا مذاق اڑا رہے تھے۔ کوئی اسے بھورا کہتا، تو کوئی لنگور۔ بچہ رونے لگا۔ آخر میں نے اپنے ساتھیوں کو منع کیا اور بچے کو گھر تک چھوڑ آیا۔ اس کے بعد ہماری باہمی دوستی ہوگئی۔ دیکھئے نا، دنیا کے مختلف حصوں میں رہنے والے لوگوں کا رنگ مختلف ہے۔ کسی قوم کی رنگت سفید ہے تو کسی کی زرد، کوئی گندمی ہے اور سیاہ، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ کوئی شخص صرف اپنے رنگت کی بنا پر اچھا یا بُرا ہے۔ اچھا وہی ہے جس کے اخلاق اچھے ہیں۔ بُرا وہ ہے جس کے اخلاق بُرے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ لوگ جب مجھے کالا کہہ کر پکارتے ہیں، تو مجھے قطعی غصہ نہیں آتا۔ البتہ افسوس ہوتا ہے کہ اتنا پڑھ لکھ کر بھی آپ ابھی تک چھوٹے بچوں کی طرح رنگ نسل اور قوم کے چکر میں پڑے ہیں۔"
اس دن کے بعد سے میں نے کسی کے منہ سے "کالے" کا لفظ نہیں سُنا۔ چند روز بعد اسکول کے واپسی پر میں نے ایک جگہ "مکان خالی ہے"، کا بورڈ دیکھا۔ گھنٹی بجائی، اوپر کھڑکی میں ایک عورت کا چہرہ دکھائی دیا۔
"مجھے یہ مکان چاہئے۔"
"یہ مکان خالی نہیں ہے۔"
"لیکن باہر لکھا ہے کہ مکان خالی ہے۔"
"میں نے کہہ دیا کہ خالی نہیں ہے، کم از کم تمہارے لئے۔"

میں مایوس ہو کر چلنے ہی والا تھا کہ اچانک اُوپر سے آواز آئی :۔

" سر، ذرا رُکیے " میں نے سر اُٹھا کر دیکھا، یہ پامیلا ڈیر تھی۔ وہ تیزی سے سیڑھیاں اُترتی ہوئی نیچے آگئی۔

" معاف کیجیے، امی نے آپ کو پہچانا نہیں تھا ۔ امی یہ ہمارے استاد ہیں، "مسٹر براتھ وائٹ"

عورت کے چہرے پر شرم کی سرخی پھیل گئی۔

" مسٹر براتھ وائٹ، تشریف لائیے "

تھوڑی دیر بعد ماں بیٹی دونوں مجھے مجبور کر رہی تھیں کہ میں ان کے ہاں آجاؤں، لیکن میں ایک اور فیصلہ کر چکا تھا۔

" مسٹر ڈیر، میں یہ مکان اپنے لئے نہیں پوچھ رہا تھا۔ اصل میں میرے ایک دوست کو مکان کی ضرورت تھی۔ اسے آپ کو پتہ دے دوں گا " یہ کہہ کر میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ تیسرے چوتھے دن پامیلا میرے پاس آئی اور خوشی سے بولی :۔

" جناب، وہ مکان ہم نے کرائے پر دے دیا۔ تین امیدوار تھے۔ ایک آپ کا ہم وطن۔ ہم نے مکان آپ کے ہم وطن کو دیا ہے "

یہ میری پہلی کامیابی تھی اور میں اس پر پھولا نہیں سما رہا تھا۔ انہی دنوں ایک اور واقعہ پیش آیا۔ سیلز ایک طالب علم تھا جس کی ماں انگریز اور باپ برٹش گیانا کا رہنے والا ایک سیاہ فام تھا۔ اس کا باپ مر گیا۔ وہ اس روز اسکول نہ آیا۔ مجھے معلوم ہوا، تو میں نے تعزیت کے لئے جانے کا پروگرام بنایا۔ گرفن بولا :۔

" ہم سب نے آپ کے کہنے کے مطابق پیسے جمع کر کے کچھ پھول خریدے ہیں۔ ہم یہ پھول وہاں بھجوانا چاہتے ہیں "

" کیوں، تم لوگ خود نہیں جاؤ گے کیا؟ "

" ہم وہاں کیسے جا سکتے ہیں ۔ لوگ کیا کہیں گے "

" کیا مطلب ؟ "

" جی وہ سیلز کا باپ تھا نا! وہ سیاہ فام تھا "

میرے دل پر جیسے ایک چوٹ سی لگی، لیکن میں خاموش رہا۔ ڈینسم بولا :۔

" کیا آپ ہم سے ناراض ہیں؟ "

"نہیں۔"

"اگر آپ حکم دیں، تو ہم وہاں پہنچ جائیں گے۔"

"میں حکم دینا نہیں چاہتا۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

چھٹی کی گھنٹی بجی، تو میں مغموم تھا۔ سیلز کے یہاں پہنچا، تو طبیعت پر ایک بوجھ سا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کئے کرائے پر پانی پھر گیا ہو۔ اچانک میری نظر سامنے کی طرف اٹھ گئی۔ ایک کونے میں میری ساری جماعت بیٹھی تھی۔ جی ہاں۔ پورے تینتالیس لڑکے اور لڑکیاں۔ میرا دل خدا کی حمد سے سرشار ہو گیا۔

دس ماہ یوں گزر گئے جیسے دس دن ہوں۔ آخر وہ دن آپہنچا جب جماعت تعلیم سے فارغ ہو گئی۔ آخری دن کلاس میں داخل ہوا۔ تو سب کے چہرے بجھے ہوئے تھے۔ میں نے انھیں چند لطیفے سنائے اور خوب ہنسایا۔ چھٹی کے وقت تک ہم بڑی دلچسپ گفتگو کرتے رہے۔ پاٹر اٹھ کر بولا:۔

"جناب، سکول سے جانے کے بعد کیا ہم آپ سے ملنے کے لئے یہاں آسکتے ہیں؟"

"کیوں نہیں، آپ سب میرے دوست ہیں۔ جب بھی تشریف لائیں گے مجھے خوشی ہوگی۔"

چھٹی کی گھنٹی بجی، تو ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ اچانک پامیلا آگے بڑھی اور سنہرے کاغذ میں لپٹا ہوا ایک پیکٹ مجھے پیش کرتے ہوئے بولی:۔

"جناب، یہ ہماری طرف سے آپ کے لئے ہے۔"

میں نے پیکٹ پر نظر ڈالی۔ اوپر جلی حروف میں لکھا تھا۔ "نہایت محبت اور عقیدت سے آپ کے لئے۔ ہماری طرف سے۔" نیچے جماعت کے تمام لڑکیوں کے دستخط تھے۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں نے کلاس کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں بھی آنسو جھلملا رہے تھے۔ میرے بچے میرے لئے رو رہے تھے۔ ○○

خوبیوں میں بے نظیر ★ فائدوں میں اکسیر
امر تیل
درد ——— زخم
چوٹ
وغیرہ کے لئے
بیحد مفید
بچّوں کی خطرناک بیماری
سوکھا
کے لئے تیر بہدف
امر تیل
تیّار کردہ
بھارت کیمیکل ورکس
تیار کردہ - بھارت کیمیکل ورکس - الہ آباد ۳

اسٹفن زوئگ

(ترجمہ:۔ محمد یعقوب فاروقی)

ڈریسڈن سے گاڑی آگے بڑھی ہی تھی کہ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی ہمارے ڈبے میں داخل ہوا اور ہم لوگوں پر ایک نظر ڈال کر بڑی خوش اخلاقی سے مسکرایا اور میری طرف خاص طور سے متوجہ ہوا جیسے میری اس کی پرانی جان پہچان ہو۔ میں اسکی اس غیر ارادی حرکت سے کچھ سٹپٹایا۔ اس گھبراہٹ کا اثر ختم کرنے کے لیے اُس نے مجھے اپنا نام بھی بتادیا۔ تب مجھے یاد آیا کہ میں اُس کو بہت دنوں سے جانتا تھا۔ مگر اُسے اتفاقیہ طور پر وہاں دیکھ کر میں اُس کا نام ٹھیک سے یاد نہیں کر پایا تھا۔ وہ برلن کا ایک تاجر تھا جو ماہر مصوّروں کی بنائی ہوئی نایاب تصویریں فروخت کیا کرتا تھا۔ اس کا نام ہیری رکنر تھا۔ جنگ عظیم سے قبل میں نے بھی اُس سے متعدد نایاب آٹوگراف اور کتابیں خریدی تھیں۔

وہ میرے سامنے والی سیٹ پر بیٹھ گیا اور بڑی بے تکلفی سے مختلف موضوع پر گفتگو کرنے لگا۔ مجھے بھی اتنے لمبے سفر میں ایک ہم سفر کی کمی کا احساس تھا جو اس کے آجانے کی وجہ سے ختم ہوگیا۔ میں نے بر سبیل تذکرہ اُس کے سفر کا مقصد پوچھ لیا۔ اس بات پر اُس نے بتایا کہ اس کی بتیس سالہ تاجرانہ زندگی میں شاید اس سے زیادہ عجیب واقعہ نہیں گذرا اور اُس نے سفر کی سرگذشت اس طرح شروع کی:۔

آپ تو جانتے ہی ہیں کہ لڑائی کے بعد روپئے کی قیمت کس طرح گر گئی ہے۔ نتیجہ کے طور پر میری تجارت کو بھی اس سے بڑا دھکا پہنچا۔ یہ وہ دور تھا جب جنگ کے منافع خوروں

کو بھی منقش قالینیں اور دیگر اشیاء کے جمع کرنے کا شوق پیدا ہو چلا تھا اور وہ اُسے ہر قیمت پر خریدنے کو تیار رہتے۔ ان کی خواہشوں کا یہ سلسلہ ہمیشہ ہی ناتمام رہتا تھا۔

اس صورت میں مجھ جیسے آدمی کو جسے بیش قیمت چیزیں جمع کرنے کا خود ہی بیحد شوق ہے دوسروں کی خواہش کی تکمیل کرنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ اگر میں اپنے تمام قدیم جمع کئے ہوئے ذخیرے کو بیچنے کا ارادہ ظاہر کرتا تو غالباً لوگ میری آستین میں لگے ہوئے بٹن سے لے کر میز پر رکھے ہوئے لیمپ تک کو خریدنے پر مُصر ہو جاتے۔ مختصر یہ کہ میرے پاس فروخت کرنے کے سامانوں میں بھاری کمی پیدا ہو گئی۔ میں نے اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرنا شروع کر دیا۔ اور اس نتیجے پر پہنچا کہ اب میرے پاس شاید ہی ایسی کوئی قیمتی شے باقی رہ گئی ہو جو نادر اور قدیم اشیاء کے قدردانوں کے ذوق کو تسکین پہنچا سکے۔ میری تجارت ہمیشہ سے بڑی شاندار رہی جو میرے باپ دادا کے زمانے سے ہی عروج پر تھی مگر مشکل یہ تھی کہ اب جو سامان میری دکان پر باقی رہ گئے تھے ان کی حیثیت کوڑے کرکٹ سے زیادہ نہ تھی جسے ایک ٹھیلہ والا بھی اپنے ٹھیلے پر رکھ کر بیچنے میں توہین محسوس کرتا۔

اس پریشانی کا حل ڈھونڈ نکالنے کے لئے میرے دماغ میں ایک شاندار ترکیب آئی۔ میں نے فوراً اپنے پُرانے گاہکوں کا رجسٹر الٹنا پلٹنا شروع کر دیا۔ دفعتہً خیال آیا کہ جنگ عظیم سے قبل جن گاہکوں نے قدیم اور نادر اشیاء خریدی تھیں وہ غالباً اپنی خستہ حالی کی وجہ سے تمام نادرات کو پھر سے بیچنے پر راضی ہو جائیں گے جو انھوں نے اپنی خوش حالی کے زمانے میں خریدی تھیں۔ اب تو جنگ نے حالت ہی بدل کر رکھ دی تھی۔ اب پریشانی یہ تھی کہ میرا رجسٹر اتنا پُرانا ہو چکا تھا کہ اُسکے حساب سے میرے اکثر خریدار یا تو ملک عدم کو سدھار چکے تھے یا پھر اتنا عرصہ گذر جانے کے بعد ان کے پاس نادرات کا بچنا ناممکن تھا۔ میں ابھی پریشانی میں تمام رجسٹر الٹ پلٹ ہی رہا تھا کہ اچانک پُرانے خطوط کا ایک بنڈل میرے ہاتھ آیا جو میرے تمام پُرانے خریداروں میں سب سے آخری گاہک کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ مگر اس کے بھی زندہ ہونے کا کوئی قابل یقین ثبوت نہیں تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اس نے جنگ کے بعد سے کوئی چیز نہیں خریدی تھی۔ ان خطوط کی تاریخ بھی بہت پرانی تھی اور یہ وہ زمانہ تھا جب اس تجارت کا سہرا میرے دادا کے سر تھا۔ میری بتیس سالہ زندگی میں اس سے کوئی ربط قائم نہ ہو سکا تھا۔ اس کے خطوط سے اندازہ کرنا زیادہ مشکل نہ تھا کہ وہ کچھ جھکّی سا آدمی ہے جو ایک دور دراز قصبے میں بڑی سادگی کے ساتھ زندگی گذار رہا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر

ابتی سے کم نہ ہو گی۔ اپنی تمام باتوں کے باوجود اس کے ذی علم اور محتاط ہونے کا ثبوت ملتا تھا۔
نادر پینٹنگز اور خطاطی کے قدیم نمونے جمع کرنے میں غالباً اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ مجھے ذاتی طور پر
خیال پیدا ہوا کہ اس کے اس شوق کی وجہ سے اب بھی اس کے پاس اس کے تمام نادرات
ضرور موجود ہوں گے یا اس کی موت واقع ہو جانے کی صورت میں اس کے ورثاء کے پاس
بالکل محفوظ ہوں گے۔

مجھے اس بات کی حقیقت دریافت کرنے کا شوق بڑا دلچسپ معلوم ہوا اور میں اس
انوکھے سفر پر کل ہی نکل پڑا حالانکہ دور دراز کا یہ سفر بڑا ہی تھکا دینے والا ثابت ہو رہا تھا اور
خاص کر اُس وقت مجھے اور بھی شک پیدا ہوا جب مجھے ایک چھوٹے اسٹیشن پر اس کے گھر کا
پتہ معلوم کرنے کے لئے اُترنا پڑا۔ سفر سے پہلے ہی میرے دل میں اس آرٹ اور فن کے قدردان کے لئے
بڑے احترام کا جذبہ پیدا ہو چلا تھا مگر اب مگا میرے دل نے سوال کیا: "کیا قدیم آرٹ کا وہ دلدادہ
اور فن مصوری کا وہ شوقین اس غیر مانوس جگہ پر اب بھی زندگی گذار رہا ہو گا؟"

اس کا پتہ لگانے میں ایک نزدیکی ڈاک خانے گیا اور یہ معلوم کرکے میری حیرت کی انتہا نہ رہی
کہ وہ ابھی تک زندہ تھا اور اپنے مکان پر موجود تھا۔ ملاقات کا شوق اور بھی بڑھ گیا۔ وہیں
ڈاک خانے سے مجھے اس کے مکان کا تفصیلی پتہ بھی معلوم ہو گیا۔ اس انوکھی ملاقات کے تصور سے
میرے دل کی دھڑکن کافی تیز ہو گئی۔ دوپہر کا وقت ہو گیا تھا۔

آرٹ کے اس عظیم قدردان ریٹائرڈ کرنل کا مکان دوسری منزل پر تھا پہلی منزل
پر ایک درزی کا مکان تھا۔ مکان کی دوسری منزل پر اس کا نام دیکھ کر میں نے گھنٹی بجائی
اور غالباً ابھی چند ہی سکنڈ گذرے ہوں گے کہ سفید بالوں والی ایک بہت ضعیف عورت
نے دروازہ کھول کر میرا استقبال کیا۔ میں نے اپنا کارڈ اُسے تھما دیا اور مالک مکان سے ملنے
کی خواہش ظاہر کی۔ اُس نے مشتبہ نگاہوں سے مجھے دیکھا مگر خاموش رہی۔ اس کے
چہرے کے نقوش سے ظاہر ہوتا تھا جیسے اُسے اس جگہ پر میرا آنا ناگوار گذرا ہو۔ پھر بھی
اس نے خندہ پیشانی کے ساتھ چند منٹ انتظار کرنے کی درخواست کی اور گھر میں داخل
ہو گئی۔ ذرا ہی دیر میں گھر کے اندر ایک مردانی آواز کو اپنا نام باآواز بلند لیتے سُن کر میں حد درجہ
مسرور ہوا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "ہیری رکنز! اچھا وہ نادر اشیاء کا تاجر! مجھے ایسے
شخص سے مل کر یقینی خوشی ہو گی۔"

ذرا ہی دیر بعد وہ عورت باہر آئی اور مجھ سے اندر چلنے کی درخواست کی۔ میں خاموشی سے اُس کے پیچھے چلتا رہا۔ کمرے کے بیچ میں ایک پُروقار شخص میرا استقبال کرنے کے لئے کھڑا تھا۔ اس کی صحت اچھی تھی اور مونچھیں بڑی گھنی تھیں۔ اس کے جسم پہ نیم فوجی لباس تھا مگر پھر بھی اس سے اس کی سادگی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اس نے نہایت بے تکلفی سے اپنے دونوں ہاتھ اپنی جگہ سے میری طرف بڑھا دئے۔ اخلاقاً مجھے اس کی طرف بڑھنا پڑا۔ اس کے بعد بھی مصافحے کے لئے اسے میرے دونوں ہاتھوں کا انتظار رہا۔ آخر کار میں بات کی تہہ تک پہنچ گیا۔ وہ اپنی دونوں آنکھوں سے معذور تھا۔

اس کے بعد اس نے نہایت پُرخلوص لہجے میں بات شروع کی "یہ میری زندگی کا ایک سنہرا موقع ہے جب برلن ایسے دور دراز علاقے سے میرے پاس آپ جیسا شخص تشریف لایا ہے۔ یوں میں آپ کی یہاں تشریف آوری کا مقصد بخوبی سمجھتا ہوں۔ بھلا ایسے حالات میں جب کہ قدیم آرٹ کا کوئی قدردان نہ ملے تو آپ کے پاس اپنے پُرانے گاہکوں کی طرف رجوع کرنے کے علاوہ چارہ ہی کیا ہے۔ مگر مجھے افسوس ہے کہ آپ کو میرے پاس آکر نا اُمیدی ہوئی ہوگی۔ مجھ جیسے پنشن یافتہ آدمی کے لئے دو وقت کی روٹی کے علاوہ کسی اور چیز کی طرف دھیان دینا ہی ناممکن ہے۔ ایک زمانہ تھا جب مجھے ان چیزوں کا بہت شوق تھا مگر اب سب شوق ختم ہو گیا ہے۔"

میں نے اُسکی غلط فہمی کا ازالہ کرتے ہوئے کہا "میرے آنے کا قطعی یہ مقصد نہیں ہے جس کا تذکرہ ابھی آپ کر چکے ہیں۔ میری خواہش تو صرف یہ تھی کہ آپ جیسے آرٹ اور فن کے قدردان کو اپنا خراجِ عقیدت پیش کرتا چلوں۔ اس طرح اپنے ایک پُرانے گاہک سے ملاقات کا شرف بھی حاصل کر لوں۔" حالانکہ میں نے یہ بات اصلیت کے خلاف کہی تھی اس لئے کہ میں تو قدیم اشیاء بیچنے نہیں بلکہ خریدنے آیا تھا۔ بہرحال میرے اس جملے سے اس کے لہجے میں نمایاں تبدیلی پیدا ہوئی اور اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ مارے خوشی کے وہ اپنی بیوی کی طرف متوجہ ہوا۔ "کچھ سنا تم نے! دیکھو میرے قدیم نادرات کے سرمایہ کی قدر کرنے لوگ کتنی دُور دُور سے آتے ہیں۔

اس کے بعد کرنل نے مجھ سے اپنے مکان پر چند گھنٹے رُکنے کی درخواست کی اور کہا چاہتا ہوں کہ آپ میرے ان نادرات کو ایک بار ضرور دیکھیے جنھیں میں نے بڑے شوق سے جمع کیا ہے۔"

وہ فوراً اپنی بیوی کی طرف متوجہ ہوا اور بولا" لسبتھ! ذرا میری الماری کی چابیاں تو دینا!"

اس کے اس جملے سے گھر میں عجیب سا ماحول پیدا ہو گیا۔ اس کی بیوی جو ابھی تک ہم لوگوں کی باتیں نہایت خاموشی اور اطمینان کے ساتھ سن رہی تھی اچانک گھبرا گئی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ میری طرف نہایت عاجزی سے جوڑ کر سر کو عجیب سی جنبش دی۔ میں اسکے اشارہ کا مطلب بالکل نہیں سمجھ سکا۔

اس کے بعد وہ اپنے شوہر کی طرف متوجہ ہوئی۔" کرنل! تم نے اپنے مہمان سے ابھی تک یہ نہیں پوچھا کہ انھیں کہیں جانا تو نہیں ہے۔ کھانے کا وقت بھی ہو چکا ہے مگر افسوس کہ گھر میں اس وقت غیر متوقع مہمان کے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔"

ذرا دیر بعد وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔" اگر آپ دوپہر کا کھانا کسی ہوٹل میں کھا کر یہاں تشریف لائیں اور شام کی چائے ہم لوگوں کے ساتھ پئیں تو ہم لوگوں کو بڑی خوشی ہو گی اُس وقت تک میری بیٹی الزبیتھ بھی آجائے گی۔ وہ بڑی سلیقہ مند لڑکی ہے۔ آپ جیسے معزز مہمان سے مل کر اسے بڑی مسرت ہو گی۔

اس نے اس جملے کے بعد میری طرف بڑی قابل رحم نگاہوں سے دیکھا جس کا واحد مقصد یہ تھا کہ میں وقتی طور پر اس بوڑھے کرنل کی جمع کی ہوئی تصاویر اور دیگر چیزوں کے دیکھنے سے انکار کر دوں۔ موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے میں نے دوپہر کے تین بجے تک اپنی مشغولیت کا پروگرام بتا دیا اور وعدہ کیا کہ تین بجے کے بعد میں وہاں ضرور پہنچ جاؤں گا۔ تب میرے پاس اُن تمام چیزوں کو دیکھنے کے لئے کافی وقت مل جائے گا۔ میرا ارادہ چھ بجے سے پہلے واپس لوٹنے کا نہیں ہے۔ میرے اس بیان سے بوڑھے کو غالباً کچھ تکلیف پہنچی کیونکہ وہ مجھے فوراً ساری چیزیں دکھانا چاہتا تھا۔ اس نے بادل ناخواستہ مجھے جانے کی اجازت دے دی اور ایک بار پھر گذارش کی" مجھے آپ کے قیمتی اوقات کا حال معلوم ہے اسکے باوجود اگر آپ چند لمحے میرے لئے نکال سکیں اور میرے شوق سے جمع کئے ہوئے نادرات کو دیکھ لیں تو میری بڑی عزت افزائی ہو گی۔"

کرنل کی بیوی مجھے باہر تک پہنچانے آئی اور دھیمی آواز میں بولی" اگر آپ کے یہاں واپس آنے سے پہلے میں اپنی لڑکی الزبیتھ کو آپ کی رہنمائی کے لئے آپ کے ہوٹل بھیج دوں

تو آپ ناراض تو نہ ہوں گے ؟ اس کی کئی وجہیں ہیں جو میں فی الوقت آپ سے نہیں عرض کر سکتی
اس بات کا کوئی مطلب نہ سمجھتے ہوئے بھی میں نے اخلاقاً کہہ دیا۔" بھلا مجھے اسمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے بلکہ مجھے آپ کی ذرّہ نوازی سے مسرت ہو گی "۔

ایک گھنٹہ بعد میں ابھی کھانے سے فارغ ہی ہوا تھا کہ ایک لڑکی میرے ہوٹل میں داخل ہوئی۔ میں نے خیال کیا کہ وہ الزبیتھ کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ وہ ایک نہایت پُرکشش اور سادہ سی لڑکی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ ایک دم سٹپٹا گئی۔ میں نے اُس کی اجنبیت دور کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا:۔

" حالانکہ ابھی تین بجنے میں کافی دیر ہے۔ پھر بھی اگر آپ لوگوں کو اعتراض نہ ہو تو میں آپ کے ساتھ چلنے کو تیار ہوں "۔

میری اس بات سے اس کی گھبراہٹ اور بھی بڑھ گئی۔ اور اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا۔" برائے مہربانی آپ تھوڑی دیر یہاں بیٹھ کر میری بات سُن لیں "۔

اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کس طرح بات شروع کرے۔ اس کے ہاتھ اور ہونٹ شدّتِ جذبات سے کانپ رہے تھے۔ بڑی مشکل سے اس نے چند جملے ادا کئے۔" میری ممی نے مجھے آپ کے پاس خاص طور سے بھیجا ہے اور آپ سے ایک درخواست کی ہے۔ آپ کے پہنچتے ہی پاپا فوراً آپ کو اپنے اکٹھا کئے ہوئے نادرات دکھائیں گے۔ نادرات .... جو غالباً اب ایک بھی باقی نہیں ہیں "۔

اتنا کہنے کے بعد اسکا گلا رُندھ آیا۔ پھر بھی اس نے بات جاری رکھنے کی کوشش کی۔" مجھے ہر بات آپ سے صاف صاف بتا دینی چاہیے ـــــ آپ کو غالباً علم نہ ہوگا کہ ہم لوگ آج کل کن حالات سے گذر رہے ہیں۔ جنگ شروع ہونے کے فوراً بعد ہی پاپا کی آنکھوں کی بینائی جاتی رہی۔ دشمنوں کے حملے کے وقت بھی اپنی بینائی ختم ہونے کی وجہ سے وہ کچھ دکر سکے جنگ سے چند سال پہلے جب اُن کی آنکھوں میں روشنی تھی تو وہ اپنا وقت سیر و شکار اور دیگر تفریحات میں بھی صرف کرتے تھے مگر اندھے ہونے کے بعد ان کی ساری توجہ اپنے جمع کئے ہوئے انھیں نادرات کی طرف مبذول ہو کر رہ گئی ہے اور وہ ان تمام چیزوں کو سینے سے لگائے پھرتے ہیں۔ فرصت کے اوقات میں وہ ان ہی چیزوں سے دل بہلانے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ وہ کچھ بھی دیکھ نہیں پاتے۔ اس کے علاوہ ان کی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

وہ اُن تمام نیلام کی رپورٹوں کو بڑے جوش سے پڑھتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں جسکے ذریعہ اُنھوں نے سامان خریدے تھے۔ پاپا کو روپئے کی گھٹتی ہوئی قیمت کا بھی بالکل اندازہ نہیں ہے۔ وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ ہم لوگ کتنے خستہ حال ہیں۔ ان کی پنشن کے روپئے سے آج کل صرف چند وقت کی روٹیاں ہی مل سکتی ہیں اور مجبوراً ہم لوگوں کو دوسرے ذرائع کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ میری بڑی بہن کے شوہر کا بھی پچھلی جنگ میں انتقال ہو گیا اور ان کے چار یتیم بچّوں کی دیکھ بھال بھی ہم لوگوں کے ذمہ ہے۔ پھر بھی خرچ کی تکلیف کا ذکر پاپا سے کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ حالانکہ ہم لوگوں کی کوشش ہمیشہ یہی رہتی ہے کہ خرچ میں جتنی کمی ہو سکے کی جائے۔ مگر روزمرّہ کی ضروریات تو پوری کرنی ہی پڑتی ہیں۔ انتہائی مجبوری کے عالم میں ہم لوگوں کو گھر کے دوسرے سامان کو بیچنا پڑا۔ چونکہ پاپا نے نوکری کے زمانے میں جو کچھ کمایا وہ دونوں ہاتھوں اسی وقت خرچ بھی کر دیا اس لئے جو تھوڑا بہت سامان گھر میں تھا اس کے فروخت ہونے میں دیر نہ لگی۔ آخر میں نوبت یہاں تک آپہونچی کہ ہمارے سامنے یہ بھیانک مقام آیا کہ یا تو انھیں بھوکا رکھیں یا پھر ان کی اتنے شوق سے جمع کی ہوئی چیزیں فروخت کر دیں۔ اس سلسلے میں انکی رائے لینا قطعی حماقت ہوتی۔ بھلا وہ اپنی زندگی میں اس بیش بہا سرمایہ سے جدا ہونا کیونکر گوارا کرتے۔ انھیں تو صحیح حالات کا علم بھی نہیں تھا۔ ہم لوگوں نے جان بوجھ کر جنگ کے ناخوشگوار حالات اور بڑھتی ہوئی قیمت کی خبریں اُن سے چھپائی تھیں اور اخبار کی ایسی خبریں اُنھیں پڑھ کر نہیں سُنائیں تاکہ ان کی صحت پر کوئی ناخوشگوار اثر نہ پڑے!

"ان کے قدیم سرمایہ سے پہلی چیز فروخت کرنے پر بڑی اچھی قیمت ملی۔ یہ ایک خوبصورت شمع دان تھا۔ دکاندار نے اُس کے کئی ہزار روپئے دیے اور ہم لوگ خوش تھے کہ اس رقم سے کئی سال بہ آسانی گذر بسر ہو جائے گا اور پاپا کی کسی دوسری چیز کو فروخت کرنے کی نوبت نہ آئے گی مگر روپئے کی حیرت انگیز گرتی ہوئی قیمت کی وجہ سے وہ رقم بھی دو ماہ کے اندر اندر ختم ہو گئی۔ بدرجہ مجبوری ہمیں دوسرا نقشین سامان فروخت کرنا پڑا۔ ویسے اُس کی قیمت بہت ملی ہوئی تھی۔ مگر ہاتھ آتے آتے اس کی قیمت اتنی مل سکی کہ چند ہفتوں بعد وہ بھی ختم ہو گئی۔ آج آپکے آنے پر ممی کی گھبراہٹ کی خاص وجہ یہی تھی۔ آج بھی پاپا ان تمام باتوں سے واقف نہیں ہیں۔ وہ اپنے سامان کو ٹھیک سے جانتے ہیں اور گنتے بھی ہیں۔ سامان پر ہاتھ پھیر کر

انھیں دیکھتے رہتے ہیں اور ہر ایک کا پورا حساب رکھتے ہیں۔ مجبوراً ہم لوگوں نے ان سامانوں اور تصویروں کی جگہ جو ہم نے فروخت کی ہیں اُسی طرح کے نقلی سامان رکھ دیے ہیں اور اُسی موٹائی کے کاغذ البم میں لگادیے ہیں تاکہ انھیں تصویروں کے غائب ہونے کا شبہہ نہ ہو اسی لئے انھیں آج بھی خبر نہیں ہے کہ ان کے جمع کئے ہوئے قدیم سرمائے کے ساتھ کیا کیا فریب کیا گیا ہے۔ وہ اپنی بینائی کے ختم ہو جانے کی وجہ سے نقلی چیزوں اور تصویروں کو اصلی سمجھ کر خوش ہوتے ہیں۔ اس قصبے کے کسی دوسرے شخص کو وہ اس لائق نہیں سمجھتے جو ان چیزوں کی قدر کر سکے۔ اسی لئے وہ اپنی چیزوں کو کسی کو دکھاتے بھی نہیں ہیں۔ ان کی نظر میں کوئی دوسرا اس کا صحیح قدرداں نہیں ہے۔ آج اگر انھیں اس حقیقت کا علم ہو جائے گا تو ان کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ میں آپ کو قسم دلاتی ہوں کہ آپ ان کے اعتماد کو کسی طرح بھی ٹھیس نہ پہنچائیں گے۔ حالانکہ ہم لوگوں نے ان کے ساتھ سخت ناانصافی کی ہے مگر ہم لوگ بھی مجبور تھے۔ زندہ رہنے کے لئے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ یتیم بچوں کی جانیں ان چیزوں سے کہیں زیادہ قیمتی ہیں۔ آج آپ نے اگر سارا بھرم کھول دیا تو ہم سب کے لئے خاص کر پاپا کے لئے یہ بات جان لیوا ثابت ہو گی"۔

ان باتوں کا جو اثر میرے دل و دماغ پر ہوا اس کو الفاظ میں بیان کرنا ناممکن ہے۔ حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے ساری حقیقت نظرانداز کرنے کا بادل ناخواستہ وعدہ کر لیا اسکے علاوہ چارہ بھی کیا تھا۔ اس کے بعد ہم دونوں کرنل کے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں مجھے اس خیال سے حد درجہ تکلیف ہوئی کہ ان دو معصوم عورتوں نے اپنی ناسمجھی اور حالات کی مجبوری سے کتنے قیمتی سرمایہ کو معمولی قیمت پر بیچ ڈالا اور اتنی نادر چیزیں ضائع ہو گئیں۔

ابھی ہم لوگ سیڑھی پر ہی تھے کہ بوڑھے کی رعب دار آواز کانوں سے ٹکرائی ——
"آیئے تشریف لائیے رکسنر صاحب ......" حالانکہ وہ اندھا تھا مگر اپنی تیز حس سے باتوں کا صحیح اندازہ کر لیا کرتا تھا۔ اس کی بیوی نے مجھ پر ایک گہری نگاہ ڈالی اور پھر اس بات کا اندازہ کر کے مطمئن ہو گئی کہ ایلزبیتھ نے مجھے ہر بات سمجھا دی ہے۔

بوڑھے کرنل نے مجھے اپنی باہوں میں پکڑ کے ایک کرسی پر بٹھا دیا اور چاروں طرف جمع شدہ چیزوں کے پلندے پھیلا دیے۔ اس نے پہلا پلندہ کھولتے ہوئے بچوں کی طرح خوش ہو کر کہا "مصوری کا یہ نادر نمونہ دیکھئے۔ اب ایسی تصویر کہیں مشکل سے ہی مل سکے گی"۔
اس کے بعد اس نے دوسرے پلندے کو بڑی احتیاط سے کھول کر ایک سادہ کاغذ

میری طرف بڑھا دیا جو اس کے خیال میں مصوری کا بیش قیمت نمونہ تھی۔ کرنل کے یہاں اس قدر خلوص تھا کہ اس کو کسی طرح اندھا سمجھنا ناممکن معلوم ہو رہا تھا۔ پھر وہ اس تصویر کی دوسری تفصیلات سمجھانے لگا ”اس کے نقوش کتنے گہرے ہیں۔ اس کا رنگ کتنا اچھوتا ہے۔ اب اس کی مثال کہاں مل سکتی ہے؟

اس کے بعد اس نے پرانے ٹکٹ کا پلندہ نکالا۔ اور البم پر چپکائے ہوئے ٹکٹ دکھلانے لگا۔ اس کے جذبات اور البم پر فرضی ٹکٹ دیکھ کر میں ایک بار پھر سہم گیا اور قریب تھا کہ میں گھبراہٹ میں ساری حقیقت ظاہر کر دوں کہ اسی وقت میری نظر اسکی سہمی ہوئی بیوی اور گھبرائی ہوئی بیٹی ایلنر بیتھ پر پڑی۔ میں نے جلد ہی اپنے جذبات پر قابو پالینے کی بھرپور کوشش کی اور کہا ”بیشک یہ نایاب ٹکٹ اپنی مثال آپ ہیں۔ نمائش یا کسی عجائب گھر میں بھی اب یہ نظر نہیں آتے“

اس کے بعد دو اور سادے کاغذ اس نے شاہکار تصویریں سمجھ کر نکالے اور بولا ”ذرا اس تصویر کے تیور بھی ملاحظہ فرمائیے ایسی انوکھی اور دلفریب تصویریں تو خواب میں بھی نظر نہیں آتیں۔ آج بھی نایاب چیزیں جمع کرنے والے ان دو تصویروں کو دیکھ کر رشک کے مارے عش عش کر اٹھیں گے“

اس طرح کرنل نے مجھے دو گھنٹے مشغول رکھا۔ یہ میری بڑی آزمائش کے لمحے تھے۔ پھر بھی میں نے اس کے تمام سرمایے کی دل کھول کر تعریف کی۔ میری اس تعریف سے خوش ہو کر وہ اپنی بیوی اور لڑکی کی طرف متوجہ ہوا ”یہ واحد شخص ہے جو آرٹ کا صحیح قدردان ہے۔ میں نے پچھلے پچاس سالوں میں خود کو شراب۔ قیمتی سگریٹ۔ تفریح اور کتابوں سے دور رکھ کر اور خود پر جبر کر کے یہ ساری انمول چیزیں جمع کی ہیں۔ میرے مرنے کے بعد تم لوگ میرے اس انمول سرمائے سے بے پناہ دولت کی مالک بن جاؤ گی۔ مگر میں چاہتا ہوں کہ کم از کم میری زندگی تک یہ ساری چیزیں میرے پاس ہی رہیں۔ میری موت کے بعد یہ شخص (میری طرف اشارہ کر کے) ان چیزوں کے بیچنے میں تمھاری مدد کرے گا اور میری پنشن کا سہارا ختم ہونے کے بعد بھی نادرات تم لوگوں کے لئے سب سے بڑا سہارا ثابت ہوں گے“

وہ جذبات کی رو میں دہ جانے کیا کیا کہتا رہا۔ اس کے بیان میں حد درجہ گداز پیدا ہو چلا تھا اور وہ اسی جوش و خروش کے ساتھ اپنے تمام پلندوں پر بڑی عقیدت سے ہاتھ پھیرتا رہا۔ اس کے اس پُر خلوص جذبے کی صحیح عکاسی مشکل ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسی سچی خوشی کی لہریں بہت کم لوگوں کے چہروں پر دیکھی ہیں۔ اس کی بیوی اور لڑکی آنکھ بھری

آنکھوں سے یہ سارا منظر دیکھ رہی تھیں۔ بوڑھا کرنل میری تعریف کے الفاظ کے جادو سے اس قدر مسحور ہو چکا تھا کہ اُسے کسی بات کی پرواہ نہ تھی۔ وہ اسی جوش و انبساط کے ساتھ مختلف پلندوں کو الٹ پلٹ رہا تھا اور مجھ سے داد و تحسین حاصل کرنے کی کوشش میں مشغول تھا۔

کچھ دیر بعد اس نے اپنی چیزوں کی نمائش کا سلسلہ ختم کیا اور میز پر کافی وغیرہ لگا دی گئی۔ مجھے حیرت تھی کہ اتنی مصروفیت کے باوجود بھی بوڑھے کرنل کے چہرے پر کسی قسم کی تھکاوٹ کے آثار نہیں تھے بلکہ وہ کچھ اور بھی تازہ دم نظر آ رہا تھا۔ ناشتے کے دوران بھی انھی وہ تمام داستانیں سنائیں جو اس کے شغل سے متعلق تھیں۔ کچھ دیر بعد جب میں نے واپس آنے کی اجازت چاہی اور گاڑی چھوٹ جانے کا خدشہ ظاہر کیا تو اسے کچھ تکلیف سی پہونچی۔ غالباً وہ مجھے کچھ دیر اور روکنا چاہتا تھا۔

مجبوراً اُس نے مجھے جانے کی اجازت دے دی۔ اگر گاڑی چھوٹ جانے کا ڈر نہ ہوتا تو وہ مجھے کسی قیمت پر جُدا نہ کرتا۔ رخصت ہونے وقت اُس کی آواز شدتِ جذبات سے بھرّائی اور ہم نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا۔ اس نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا جو اس کی نظر میں میرے لیے سب سے بڑا خراجِ تحسین تھا۔

"آپ کی آمد میرے لیے بے پناہ مسرت کا پیغام تھی" اس نے کہا "میری اس سے بڑی خوش قسمتی کیا ہو سکتی ہے کہ میں نے اپنے انمول نادرات ایک ایسے شخص کو دکھائے جو واقعی اس کا اہل ہے۔ میں آپ کی آمد کی صرف اتنی قیمت دے سکتا ہوں کہ اپنی وصیت میں آپ کی فرم کو ان تمام قدیم اثاثے کو فروخت کرنے کا حق محفوظ کر دوں"۔ اس کے بعد اس نے پھر بڑی معصوم ادا سے اپنے پلندوں پر ہاتھ پھیرا۔

"کیا آپ ان چیزوں کے لیے خوبصورت فہرست تیار کرا دیں گے ...... یہ میری آخری خواہش ہے"۔ یہ اس کے آخری الفاظ تھے۔

اس کے بعد میں نے اس کی بیوی اور ایلزبتھ پر نظر ڈالی۔ جو خود پر پوری طرح سے قابو پانے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔ اُنھیں یہ ڈر تھا کہ ان کی پُر درد اور رقت آواز کہیں بوڑھے کرنل پر ساری اصلیت ظاہر نہ کر دے۔ میں نے اس کی تسلی کی خاطر وعدہ کر لیا کہ اس کی خواہش کی تکمیل کی جائے گی۔ اس پر اس نے فرطِ مسرت سے میرے دونوں ہاتھ بھینچ لیے۔

اس کی بیوی اور ایلز بتھ مجھے دروازے تک پہنچانے آئیں۔ میں نے محسوس کیا کہ بوڑھے کی پُر اثر باتوں کے بعد ان دونوں کی قوتِ گویائی سلب ہو چکی ہے۔ دونوں کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ میں خود بھی اپنے پر قابو پانے سے قاصر تھا۔ ایک پیشہ ور تاجر کی حیثیت سے میں یہاں خریداری کرنے آیا تھا مگر حالات نے ساری باتیں ہی اُلٹ دی تھیں۔ میری حیثیت ایک خوش نصیبی کے فرشتے کی سی تھی جس کا مقصد ایک بوڑھے انسان کو خوش کرنا تھا۔ مجھے اپنے جھوٹے وعدے پر حد درجہ شرمندگی تھی مگر اس کے ساتھ ہی میں مسرور بھی تھا کہ اس جھوٹ سے ہی بوڑھا خوش رہ سکتا تھا کیونکہ میرے جھوٹے وعدے اور حقیقت پر پردہ ڈالنے سے بوڑھے کے دل کو بہت سکون ملا تھا۔

میں نے ابھی بمشکل گلی میں قدم رکھا ہی تھا کہ کسی کھڑکی کھلنے کی آواز آئی اور کسی نے میرا نام پکارا۔ یہ اس بوڑھے کرنل کے سوا کوئی دوسرا نہ تھا۔ جو مجھے دیکھ تو نہ سکتا تھا مگر اپنی حس کی وجہ سے میری سمت کا اندازہ لگا چکا تھا۔ وہ کھڑکی پر جھول سا گیا اور اگر گھر کے دوسرے افراد اس کو نہ سنبھالتے تو وہ گر گیا ہوتا۔

اس نے اپنا رومال ہلاتے ہوئے باآوازِ بلند کہا۔ "رکنر تمھیں تمھارا سفر مبارک ہو۔" اس کی آواز میں بچوں کی سی معصومیت اور خوشی تھی۔ میں اُس کے پُر مسرت چہرے کو کبھی فراموش نہیں کر سکوں گا۔ میرے ایک ذرا سے جھوٹ نے اس کی زندگی کو بربادی کے گڑھے میں گرنے سے بچا لیا تھا۔ میں ابھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا کہ میں نے جھوٹ بول کر صحیح کیا یا غلط۔
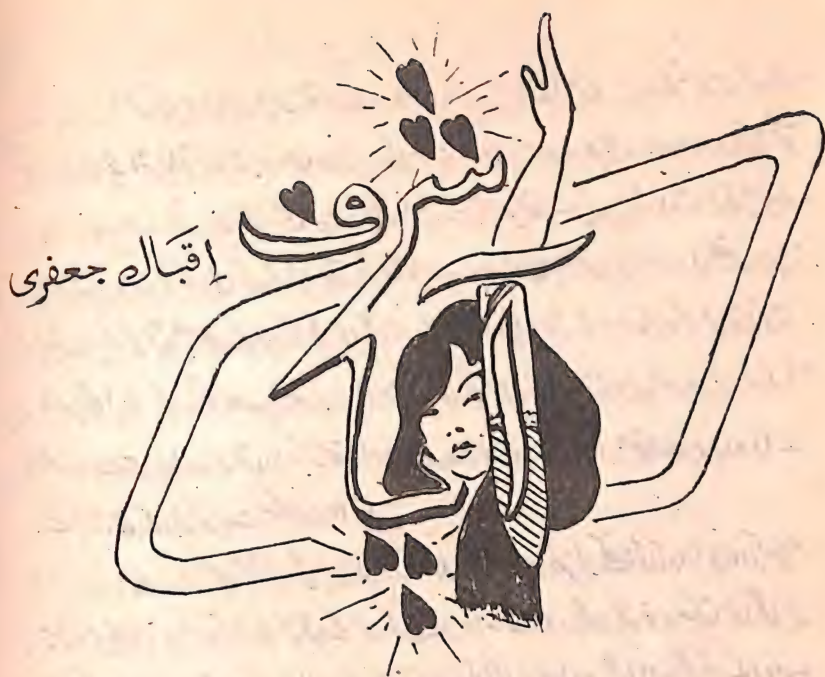
"اشرف آپا کہاں گئیں ______؟"

"اُن کی چھوٹی بہن کا کیا ہوا جو سینی ٹوریم میں موت سے لڑ رہی تھی ______؟"

میں سوال کرتا ہوں ______ لیکن جانتا ہوں کہ میرے ان سوالوں کا جواب نہ امّی کے پاس ہے نہ زبیدہ چچی، خالہ اور آپی کے پاس ______ اُن کے پاس تو جہالت ہے ______ تنگ ذہنی ہے ______ تاریکی ہے ______ گہری تاریکی!۔

کئی برس بیت گئے ہیں ______!۔

نئے محلے میں ہر ایک کی زبان پر اُن کے قصے تھے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ لڑکیاں ایسی بھی ہوتی ہیں! یک منزلہ مکان میں رہنے والی بھی ایسی ہو سکتی ہے ______! میں اکثر سوچتا تھا کہ وہ کیسی آزاد ہیں جو گاتی ہیں نہ ناچتی ہیں ______ جنھیں ہارمونیم سے دلچسپی ہے نہ گھنگروں کا شوق ______!

میں نے متعدد بار اُنھیں گلی سے گذرتے دیکھا تھا۔ مجھے وہ اچھی لگیں۔ سُرخ سرخ ہونٹ ______ بالکل انوکھے انداز سے بنے ہوئے لمبے بال اور بڑی بڑی سیاہ آنکھیں ______ میں بہت دور تک اُنھیں جاتا دیکھتا رہتا۔

آہستہ آہستہ، محلے میں ہم پرانے ہونے لگے۔ میں نے اُن کے گھر جانا شروع کر دیا۔ سلیقے اور خوبصورتی سے سجے ہوئے چھوٹے سے گھر میں وہ بالکل تنہا رہتی تھیں۔ جس دن میں نہ جا پاتا یا وہ دن بھر کیلئے کہیں چلی جاتیں، تو مجھے عجیب سی اُداسی کا احساس ہوتا۔ اُنہیں بھی مجھے دیکھے بغیر چین نہ آتا ــــــ!

وہ دن مجھے آج بھی یاد ہے اور شاید ساری زندگی دل پر نقش رہے گا۔ اُس دن میں نے اُن سے وہ سب کچھ کہہ دیا تھا جو اپنے گھر میں سُنا کرتا تھا۔

"اشرف غسل میں پورے دو گھنٹے صرف کرتی ہے ــــــ" ہماری آپی کہتی ہیں۔

"اچھا ــــــ" وہ مسکرادی تھیں۔

"ایک گھنٹہ تک بالوں کو سنوارتی ہے ــــــ" زبیدہ چچی کہتی ہیں۔

"اور ــــــ" وہ مسکراتی رہیں۔

"اشرف سرخی اور پاوڈر کتنا تھوپتی ہے ــــــ" ہماری امّی کہتی ہیں۔

"ــــــ" اُداس مسکراہٹ۔

"اُس کے چہرے پر چیچک کے داغ ہیں جنھیں وہ خوبصورتی سے چھپا لیتی ہے ــــــ اشرف کالی کلوٹی تو ہے ــــــ مگر بنتی کس قدر ہے۔"

"ــــــ" مسکراہٹ۔ خاموشی۔

"اشرف خاندان کا نام ڈبو رہی ہے ــــــ جس خاندان کی عورتوں نے مرتے دم تک کسی اجنبی مرد کی جھلک بھی نہ دیکھی ہو ــــــ آج اس خاندان کی چھوکری اپنی نمائش کرتی پھر رہی ہے ــــــ"

"ــــــ"

"اشرف راتوں کو دیر سے گھر لوٹتی ہے ــــــ کہاں غائب رہتی ہے ؟" ہماری امّی پوچھتی ہیں۔

"جاتی ہو گی کہیں ــــــ خالہ کہتی ہیں ــــــ

"ــــــ" مسکراہٹ پھیکی پھیکی سی۔

"سنا ہے ایک بار اسپتال میں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ڈاکٹر کے پاس بیٹھی تھی۔
____" امّی سرگوشی کرتی ہیں۔
"اچھا ____"، پھیکی مسکراہٹ ہنسی میں بدل گئی۔
"اشرف کلنک کا ٹیکہ ہے ____" خالہ کہتی ہیں۔
"بس کرو ____" بھینچے ہوئے ہونٹ ____ کانوں پر دونوں ہتھیلیاں
چہرے پر بے بسی کی جھلک۔
"آپ آزاد ہیں آپا ____ ؟" میں نے پوچھا تھا۔ اور انھوں نے مجھے
سینے سے چمٹا لیا تھا۔
"خدا شاہد ہے میرے بھیا ____ وہ سب دیکھ رہا ہے ____"
"وکلنک کا ٹیکہ کیسا ہوتا ہے آپا ____ ؟"
"شبّی! یہاں سے میلوں دور، سینی ٹوریم میں، میری چھوٹی بہن پر کیا بیت
رہی ہے کوئی نہیں جانتا ____ میں ہی اُس کی ماں ہوں ____ میں ہی باپ،
بھائی اور بہن ____ میں محنت کرتی ہوں ____ بڑے لوگوں کے
بچوں کو پڑھاتی ہوں ____ رات گئے تک کپڑے سیتی ہوں ____ کیا
محنت آزادی ہے ____ بے پردگی کلنک کا ٹیکہ ہے ____" لاوا پھوٹ پڑا تھا۔
"آپا! آپ تو بہت زیادہ پاک اور صاف رہتی ہیں ____"
"ہاں شبّی! یہی پاکی ان کے نزدیک غلاظت ہے ____ آوارگی ہے۔
کلنک کا ٹیکہ ہے ____ تم تو مجھے "ازاد نہیں سمجھتے نا میرے بھیا۔
"نہیں آپا آپ تو بہت اچھی ہیں ____"
مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اُس شام دو تانگے اُن کا سامان منتقل کرنے کیلئے
آئے تھے تو میں اُن کے قدموں سے لپٹ پڑا تھا۔ سامان تانگوں میں بھرا جا چکا
تھا۔ لیکن میں نے اپنی پوری طاقت سے اُن کے قدم تھام رکھے تھے۔ اور میری
آنکھوں سے آنسوؤں کی دھارا بہہ رہی تھی۔ اور پھر تانگوں پر سے سامان اتار لیا گیا تھا۔
میں روتے روتے اُن کی گود میں سر رکھ کر سو گیا تھا ____
دوسری صبح، اُن کے دروازے پر پڑے، بڑے سے اجنبی تالے نے
میرے ضبط کو آزمایا تھا ____!

دس برس بعد، وہ مجھے پینڈرارڈ سینی ٹوریم میں ملیں ـــــ میں گیلری میں کھڑا بہت دور، فضاؤں میں کچھ تلاش کر رہا تھا۔ سورج ڈوب چکا تھا۔ اور شفق کی سُرخی پھیل رہی تھی۔ چاروں طرف اُداس اُداس سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ دور کسی وارڈ میں ریڈیو سے ایک گیت اُبھر رہا تھا: "سنو چھوٹی سی گڑیا کی لمبی کہانی"

ـــــ یکایک ایک جسم میرے مقابل آیا اور اُس نے مجھے لپٹا لیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ جسم انتہائی سرد تھا اور کانپ رہا تھا۔ اور دوسرے ہی لمحہ وہ مجھ سے علیحدہ ہو گئیں۔ تب میں نے اُنھیں پہچان لیا۔ وہ بالکل بدل گئی تھیں۔ لیکن اُن کی آنکھیں ـــــ میں ہزاروں میں پہچان سکتا تھا۔ اُن کی آنکھوں میں بلا کا دُکھ جھلک رہا تھا۔ اور ننھے موتی ٹوٹنے کو تھے۔

اشرف آپا نے مجھے بتایا کہ وہ ٹی۔بی۔ سینی ٹوریم میں لازم ہیں اور اُس راہ پر مضبوط چٹان کی مانند حائل ہیں جس پر سے بہت عرصہ پہلے، اُنکی چھوٹی بہن گذر کر، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کہیں کھو گئی تھی۔ اُنھوں نے مجھ سے امی، آپی، زبیدہ چچی اور خالہ کے بارے میں پوچھا اور میرا سر ندامت سے جُھک گیا۔ میں نے اُنھیں بتا دیا کہ آپی شادی سے پہلے ہی محلے کے تانگے والے کے ساتھ فرار ہو گئی تھیں۔ زبیدہ چچی، چچا سے لڑ جھگڑ کر مائیکے جا بیٹھی تھیں اور خالہ اور امی اپنے بلانے والے کے پاس پہنچ چکی تھیں ـــــ ! میں اپنی رو میں کہتا رہا۔ اور اشرف آپا کے رخسار نم ہوتے رہے۔ میں بہت دیر تک خاموش کھڑا اُنھیں دیکھتا رہا۔ اُن کے مقدس سفید لباس کو چھوتا رہا۔ اور تب میرے ذہن کے کسی گوشہ میں ایک سوال اُبھرا۔ اور کچھ دیر کی ذہنی کشمکش کے بعد میں نے اُن سے پوچھ لیا۔

"آپا! آپ نے شادی تو کر لی ہوگی ـــــ ؟"

اُنھوں نے اثبات میں سر ہلایا اور نئی نویلی دلہن کی طرح شرما گئیں۔ حیا کی وہ سُرخی اُن کے چہرے کو دس سال پیچھے لے گئی۔

"ہاں ـــــ میں نے شادی کر لی ہے ـــــ اپنے پیشے سے ـــــ اس لباس سے ـــــ انجکشنوں اور دواؤں کی بوتلوں سے ـــــ اپنے مریضوں کی کراہوں سے ـــــ اور یہ رشتہ میری موت کے ساتھ

میں جانتی تھی شبّی! تم یہ سوال ضرور کرو گے ــــــ ہی ٹوٹ سکے گا ــــــ لیکن شاید اب ضد نہ کرو گے۔"
ــــــ تم مجھ سے واپس چلنے کیلئے بھی کہتے ــــــ
وہ بہت دیر تک خاموش، میرے مقابل کھڑی مجھے دیکھتی رہیں۔
"جلدی سے اپنے کیمرہ میں میری تصویر اتار لو ــــــ مجھے معاف کر
ــــــ میرے مریضوں کی دوا کا وقت ہو گیا ہے ــــــ"
میں نے اُن کی تصویر اُتار لی تھی۔ اُن سے پابندی سے خط لکھنے کا
وعدہ لیا تھا اور نڈھال قدموں سے واپس ہوا تھا۔
اور پھر ایک دن مجھے معلوم ہوا کہ اشرف آپا نے، زخمیوں کی دیکھ بھال
کیلئے، اپنی خدمات، کسی فوجی اسپتال کیلئے وقف کر دی ہیں اور وہ سرحد پر کسی
کیمپ اسپتال میں تعینات کر دی گئی ہیں ــــــ!
دن گذرتے رہے ــــــ میں نے اُنھیں متعدد خطوط لکھے لیکن جواب
نہیں ملا ــــــ اور تب میں نے وزارتِ دفاع سے رجوع کیا تھا ــــــ!
میری میز پر سنہرے فریم میں اُن کی تصویر مسکرا رہی ہے اور میرے سامنے وزارتِ
دفاع سے آیا ہوا مختصر سا خط رکھا ہے جس پر میری روح کے موتی آنکھوں سے ٹوٹ
ٹوٹ کر جم چکے ہیں۔
"مس اشرف جہاں کے متعلقین کے بارے میں ہم لاعلم تھے۔ اگر آپ
کا اُن سے کوئی رشتہ ہے تو ہمیں آپ سے ہمدردی ہے۔
انتہائی افسوس کے ساتھ ہم یہ لکھ رہے ہیں کہ ستمبر ۱۹۶۵ء میں، کیمپ
اسپتال پر، دشمنوں کی بمباری کی وجہ سے، وہ اپنے فرائض انجام دیتے ہوئے
شہید ہو گئیں۔
ملک و قوم کیلئے اُن کی قربانی اور خدمات بے مثال ہیں ــــــ
ــــــ اور اُن کا نام امر رہے گا ــــــ!"

اطلاع

فسانہ کی ضخامت اور قیمت میں اضافہ

ناظرین کو اس خبر سے مسرت ہوگی کہ آئندہ ماہ سے ہم نے فسانہ کے صفحات میں اضافہ کا فیصلہ کیا ہے جس کی بنا پر ہمیں اُس کی قیمت میں معمولی سا اضافہ کرنا پڑ گیا ہے۔

آئندہ سے فسانہ کا شمارہ ایک روپیہ میں حاصل ہو سکے گا ۔

FORM IV

(See Rule 118)

1. Place of ublication	...	Usmani Manzil
	...	216, Daira Shah Ajmal
	...	Allahabad-3
2. Periodicity of its publication	...	MONTHLY
3. Printer's Name	...	Masood Ahmad
Nationality	...	INDIAN
Address	...	128, Sabzi Mandi (Pipal wala per) Allahabad-3
4. Publisher's Name	...	Masood Ahmad
Nationality	...	INDIAN
Address	...	128, Sabzi Mandi (Pipal wala Per) Allahabad-3
6. Names and addresses of individuals who own the newspaper and partners or shareholders holding more than one—percent of the total capital.		(a) Smt Jovairia Usmani w/o Late Sri Aminul Hasan 195, Daira Shah Ajmal Allahabad-3 (a) Sri Masood Ahmad 128, Sabzi Mandi (Pipal-wala Per) Allahabad-3

I, Masood Ahmad, hereby declare that the particulars given above are true to the best of my knowledge and belief.

MASOOD AHMAD
Signature of Publishar.

Date : 1—3—1967.

بہارِ نو
بہار نو ٹانک بچوں کے تمام اعضا کو طاقت بخشتا ہے
اور دانت نکلنے کی تکلیف سے محفوظ رکھتا ہے
انگوری
معدہ، جگر اور تمام اعضاءِ رئیسہ اور گردوں کی کمزوری
کو دور کرتی ہے، انگوری میں انگور کے علاوہ اور
بہترین ادویات سے اس کی قوت میں اضافہ کیا گیا ہے
ہر موسم اور ہر عمر کے لئے مفید اور صحت بخش ہے
شربت
نزلہ
معمولی بخار۔ کھانسی
زکام۔ نزلہ کے لئے
فواکہین
تازہ پھلوں کے رس سے تیار
کی جاتی ہے۔ جس کے استعمال
سے معدہ، جگر، اور گردوں
کا فعل بہت بہتر ہو جاتا ہے۔
اور اس میں قوت آجاتی ہے۔
صالح خون کی بہتر تولید میں اضافہ
کرتی ہے۔ دل کو قوت پہنچاتی ہے۔
ریاح کی تولید کو کم کرتی ہے اختلاجِ قلب
کی تکلیف اور خون کے دباؤ کی زیادتی کو
دور کرتی ہے۔
چند مشہور اور پیٹنٹ دوائیں
DAWAKHANA TIBBIYA COLLEGE M.U. ALIGARH
دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی۔ علی گڈھ یو۔پی۔

نادر و نایاب تحفے
روغن برق رجسٹرڈ
یونین کیمیکل ورکس کی کامیاب ایجاد
گھر کا ڈاکٹر
ہر قسم کے درد۔ چوٹ۔ موچ۔ ورم۔ زخم۔ دردِ سر۔ دردِ چشم
اعصابی تکالیف۔ بچھو بھڑ کے ڈنک۔ دردِ کمر۔ خناق
میٹھوا۔ درد کان درد دانت۔ درد پسلی۔ سوکھا روگ
نزلہ۔ زکام۔ گھٹنوں کا درد۔ ورم طحال۔ درد گردہ۔ درد سینہ۔ اعصابی کمزوری
نمونیہ۔ جلنے اور کٹنے کے لئے بہت مجرب اور زود اثر ثابت ہوا ہے۔
قیمت فی شیشی ۴۰ پیسہ، ۸۰ پیسہ، ایک روپیہ ۴۵ پیسہ، دو روپیہ ۵۰ پیسہ
روغن سملبائی
لاکھوں مریض شفایاب ہو چکے ہیں
پورے اور آدھے سر کے درد اور ایسے درد سر کے
لئے جو سورج کے بڑھنے اور گھٹنے کے ساتھ بڑھتا اور
گھٹتا ہو اور آنکھوں کے ڈھیلوں میں شدت کا
درد ہو، حد درجہ مفید ہے۔
ہزاروں لاکھوں اشخاص نے اس خداداد نعمت سے
شفا حاصل کی ہے۔ آپ بھی استعمال کریں اور
قدرت خداوندی کا کرشمہ دیکھیں۔
قیمت فی شیشی ۹۰ پیسہ، ایک روپیہ ۵۰ پیسہ، ۲ روپیہ ۴۵ پیسہ
قمر الدین بدر الدین پرفیومرس
چوک الٰہ آباد ۳

KARKHANA DARUSSEHAT
K DS
QUDRATI TEL
INDICATIONS
PAIN IN JOINTS AND MUSCLES, SPRAIN, SWELLING, CUTS & BURNS
DARUSSEHAT
جہاں گیا
چھا گیا
درد، زخم، چوٹ
موچ، کٹنے اور
جلنے پر
مفید
ہے
قدرتی تیل
قائم شدہ ۱۹۰۳ء
کارخانہ دارالصحت مئوناتھ بھنجن، یوپی

زردے کے موجد
احمد حسین دلدار حسین پرائیوٹ لمیٹڈ
چوک لکھنؤ
کا
تیار کردہ
زردہ
قوام
گولی
پان کی جان ہے
اسکی لذت شروع سے آخر تک یکساں قائم رہتی ہے
احمد حسین دلدار حسین پرائیوٹ لمیٹڈ
ہیڈ آفس۔ چوک لکھنؤ
فون نمبر ۲۵۳۱۷
کارخانہ۔ عبدالعزیز روڈ۔ لکھنؤ
فون نمبر ۲۵۹۵۵